جلد ۸۰ دسمبر ۱۹۷۳ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تاجر و ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر

تفہیم القرآن

جلد سوم، جلد چہارم، جلد پنجم اور جلد ششم

طبع ہو کر آگئی ہیں۔ اپنی مطلوبہ تعداد کے حصول کے لیے
آج ہی آرڈر سے مطلع فرمائیں
جلد اوّل زیر طبع ہے۔ انشاء اللہ العزیز جلد تیار ہو جائے گی۔

تفہیم القرآن

جلد اوّل	سورۃ الفاتحہ ــــ سورۃ الانعام		زیر طبع
جلد دوم	سورۃ الاعراف ــــ سورۃ بنی اسرائیل	ہدیہ	۳۰/- روپے
جلد سوم	سورۃ الکہف ــــ سورۃ الروم	"	۳۳/- روپے
جلد چہارم	سورۃ لقمان ــــ سورۃ الاحقاف	"	۲۸/- روپے
جلد پنجم	سورۃ محمد ــــ سورۃ الطلاق	"	۳۰/- روپے
جلد ششم	سورۃ التحریم ــــ سورۃ الناس	"	۳۰/- روپے

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۰ | دسمبر ۱۹۷۳ء مطابق ذیقعد ۱۳۹۳ھ ہجری | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

زرِ سالانہ دس روپیہ — فی پرچہ ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا - پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

وفاقی حکومت نے حال ہی میں ملک کے اندر وطن دشمن رجحانات اور سرگرمیوں کے سدِ باب کے لیے ایک آرڈی ننس جاری کیا ہے جس کی رو سے اُسے یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ ہر ایسی تنظیم یا جماعت کو ملک دشمن قرار دے سکتی ہے جس کی سرگرمیاں ملک کی خود مختاری، علاقائی سالمیت، اور داخلی امن و امان کے حق میں مضر ہوں۔ نیز اس آرڈی ننس نے اُسے اس بات کے بھی وسیع اختیارات دیے ہیں کہ وہ وطن دشمن اور باغیانہ سرگرمیوں کے انسداد کے لیے مؤثر اقدام کر سکے اور ملک کے کسی بھی حصّے کی علیحدگی کی کوششوں اور ملک کی خود مختاری و علاقائی سالمیت کے منافی سرگرمیوں اور ایسے علاقائی محاذ قائم کرنے کی کوششوں کو ـــــ جن کی اساس نسلی و لسانی تصورات پر یا اسی قسم کے دیگر نظریات پر استوار ہو اور جن سے فرقہ وارانہ اور صوبائی تعصب پھیلنے کا اندیشہ ہو یا جن کے ذریعے یہ زہریلا پراپیگنڈا کیا جا سکے کہ پاکستان کے باشندے واحد پاکستانی قوم نہیں ـــــ خلافِ قانون قرار دیا جا سکے گا۔ اس آرڈی ننس میں ہائی کورٹ کے جج کی سربراہی میں ٹربیونل قائم کرنے اور وطن دشمن سرگرمیوں کے مرتکب افراد کو قید اور جرمانہ کی سزائیں دینے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

پاکستان کا کوئی بھی بہی خواہ اور محب وطن شہری کسی ایسے اقدام سے اختلاف نہیں کر سکتا جس کا مقصد نظریۂ پاکستان کا تحفظ اور ملک و ملت کے اتحاد اور سالمیت کی پاسبانی ہو۔ مگر ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہنے پر مجبور ہیں کہ گذشتہ پچیس سال سے یہاں کے مختلف افراد اور جماعتوں اور خصوصاً برسرِ اقتدار طبقوں نے اپنے مخالفین پر وطن دشمنی اور غداری کے الزامات اس کثرت سے لگائے ہیں کہ ان کی معنویت بالکل زائل ہو چکی ہے۔ لوگوں کے اندر اب یہ احساس پوری طرح پرورش پا چکا ہے کہ یہ الزامات حکومت کے اسلحہ خانہ کے وہ زنگ آلود اور بوسیدہ ہتھیار ہیں جنہیں حکومت کارگر اسلحہ سمجھتے ہوئے اپنے مخالفین کے خلاف اپنی عادت کے مطابق بے محابا استعمال کرتی رہتی ہے ورنہ حقیقت میں ان کی حیثیت اب چلے ہوئے کارتوسوں

کی سی ہے جو کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

عوام کے اندر اگر ان الزامات کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے تو اس کے بعض ٹھوس وجوہ ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں اب یہ ایک روایت سی بن گئی ہے کہ ہر وہ شخص یا گروہ جو حکومت سے معمولی اختلاف بھی رکھتا ہے یا حکومت کے افکار و نظریات یا اس کے کارناموں پر مدح و ستائش کے بجائے حرف گیری کرتا ہے وہ غدار، تخریب پسند اور وطن دشمن ہے۔ مگر اس کی غداری، تخریب پسندی اور وطن دشمنی کو کسی عدالت میں چیلنج کر کے ثابت نہیں کیا جاتا۔ حکومت کے ذرائع ابلاغ یا برسر اقتدار گروہ کے چند افراد یا ان کے حاشیہ نشین ہی موقع بے موقع اس الزام کو حکومت سے اختلاف رکھنے والے عناصر پر عائد کرتے رہتے ہیں اور جہاں اپنے اس الزام کو زیادہ بودا محسوس کرتے ہیں وہاں اسے زیادہ وزنی بنانے کے لیے تنقید کی زبان کھولنے والوں کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ جب کوئی فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ پر الزام لگائے اور پھر خود ہی شاہد، منصف اور جلاد کے فرائض بھی سرانجام دینے لگے تو الزام لگانے والوں کا یہ طرزِ عمل خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اس الزام کو کھوکھلا محسوس کر رہے ہیں اس لیے وہ اس بات کی جرأت نہیں کر سکتے کہ کسی غیر جانبدار شخص یا ادارہ کے سامنے اُسے پیش کر کے اس کے صحیح اور درست ہونے کے بارے میں فیصلہ حاصل کر سکیں۔ انسان خواہ کتنا ہی سلیم الفطرت ہو اس کے اندر یہ کمزوری بہرحال پائی جاتی ہے کہ وہ محبت اور نفرت کی صورت میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیشہ یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ مدعی نہ تو گواہ کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور نہ انصاف کی کرسی پر براجمان ہو کر اپنے دعوے کے حق میں خود ہی فیصلہ کرنے لگے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اِس مروجہ ضابطہ انصاف کو یکسر نظر انداز کر کے برسر اقتدار طبقے خود ہی اپنے مخالفین کے خلاف الزام تراشیاں کرتے ہیں اور پھر خود ہی حکم بن کر اختلاف کرنے والوں کو سزا سناتے ہیں اور بعد ازاں ان کی تعذیب شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اپنے خیال میں جن لوگوں کو ناپسندیدہ عناصر سمجھتی ہے ان کے خلاف انصاف کا کوئی تقاضا پورا کیے بغیر دستِ ظلم دراز کر دیتی ہے اور عوام کے اندر

اس کے اس غلط، جابرانہ اور غیر منصفانہ طرزِ عمل سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ غداری، اور وطن دشمنی کے الزامات بالکل بے بنیاد ہیں اور ان الزام تراشیوں کا مقصد صرف اختلاف کی آواز کو دبانا ہے۔

اس غیر منصفانہ طرزِ عمل کے علاوہ برسرِ اقتدار طبقوں کا مختلف اوقات میں حزبِ اختلاف کے ساتھ عدمِ یکسانیت کا بلکہ متضاد رویہ بھی حکمران طبقے کی نیت کے بارے میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ آج تختِ شاہی سے اعلان ہوتا ہے کہ فلاں فلاں افراد یا جماعتیں وطن دشمن اور غیر ملکی طاقتوں کی ایجنٹ ہونے کی بناء پر گردن زدنی ہیں اور اگر ان کا قلع قمع نہ کیا گیا تو ملک و ملت کی تباہی یقینی ہے۔ حکومت کے پاس ان کے غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ تعلقات اور اُن سے مالی امداد اور عملی رہنمائی حاصل کرنے کے واضح ثبوت موجود ہیں اِس لیے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا حکومت کا بنیادی فرض ہے۔ ان تخریب پسند گروہوں کی سرگرمیوں سے حکومت اب اغماض برت کر ملک کی تباہی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ حکومت بڑے وسیع ذرائع اور اختیارات اور ان لوگوں کی تخریبی کارروائیوں اور غیر ملکی قوتوں کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کے واضح ثبوت رکھنے کے باوجود ان کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی کرنے سے ہمیشہ عاجز رہتی ہے اور جب بھی ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی ہے تو وہ اتنا بھونڈا، غیر معقول اور غیر منصفانہ ہوتا ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی منتقم مزاج آمر ملکی سالمیت کی آڑ میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہے اور ملت کے تحفظ کے نام پر اپنے غیر مسئول اقتدار کے تحفظ میں مصروف ہے۔ عوام یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب ہوتے ہیں کہ وطن دشمن سرگرمیوں اور تخریب پسندانہ کارروائیوں کی یہ آخر کونسی قسم ہے جسے تختِ شاہی پر براجمان لوگوں کی قوتِ شامہ تو سونگھ سکتی ہے مگر قانون کی گرفت میں لانے سے قاصر رہتی ہے۔ بغاوت اور تخریب کی جڑیں اگرچہ انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوتی ہیں مگر باغیانہ کارروائیاں اور تخریبی سرگرمیاں کوئی ایسی ڈھکی چھپی حرکات نہیں ہوتیں جو لوگوں کی نظروں سے مستور اور قانون کے احتساب سے باہر رہ سکیں۔ ہمارے ہاں تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ الف اور ڈیفنس آف پاکستان رولز —— غداروں اور ملک دشمن سرگرمیوں کا ارتکاب کرنے والوں کا بڑی خوبی سے محاسبہ کر سکتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں حالیہ آرڈیننس کا نفاذ اگر حکمران طبقے کی نیت کے بارے میں ذہنوں میں خلش پیدا کرتا ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں خصوصاً جب عوام کو اس بات کا بھی اچھی طرح علم ہے کہ یہ آرڈیننس عین اُس وقت جاری کیا جا رہا ہے جبکہ قومی اسمبلی کا سرمائی اجلاس شروع

ہونے ہی والا ہے۔ جمہوریت کے دعوے کے ساتھ ملک میں آرڈیننسوں کے ذریعہ حکومت کرنے کا شدید رجحان حکمران گروہ کے دعوئے جمہوریت کی کھلی تردید کرتا ہے۔

پھر سیاست کے آثار چڑھاؤ میں یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج کے دوست کل کے دشمن ہوتے ہیں اور آج کے دشمن کل کے دوست بن جاتے ہیں مگر یہ مناظر کبھی دیکھنے میں نہیں آئے کہ آج ایک فرد یا گروہ کو پورے یقین اور وثوق کے ساتھ وطن دشمن، ملک و ملت کا غدار اور غیر ملکی ایجنٹ قرار دے کر اُسے عذاب الیم کی وعید سنائی جا رہی ہوتی ہے لیکن یکا یک عوام کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اصحاب اقتدار ان وطن دشمنوں اور غداروں کے ساتھ جیل خانوں میں محبت اور اخوت کے رشتے قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اگر وہ برسرِ اقتدار طبقے کے معاملے میں اپنے اندر کوئی "خوشگوار تبدیلی" پیدا کر لیں تو ان تخریب پسند عناصر کو اونچے سے اونچے مناصب بھی دیے جا سکتے ہیں۔ اربابِ حکومت کے نقطۂ نظر میں ان معتوب لوگوں کے بارے میں یہ اچانک تبدیلی جس کے بظاہر کوئی وجوہ نہیں ہوتے، ان کے خلوص کو کافی حد تک مشتبہ بنا دیتی ہے۔ لوگ اس قلبِ ماہیت پہ حیران ہوتے ہیں کہ اگر کچھ افراد اور گروہ فی الحقیقت وطن دشمن اور تخریب پسند تھے اور جہاں تک ملکی سالمیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی بھی نہیں آتی تو پھر یہ ناپسندیدہ عناصر آناً فاناً اربابِ اقتدار کی آنکھوں کا تارا کس طرح بن گئے؟ کیا وطن دشمنی کا الزام محض بہتان تھا؟ جس کی کوئی حقیقت نہ تھی اور یہ سب کچھ اختلاف رکھنے والوں کو بدنام اور رسوا کرنے کے لیے کیا جا رہا تھا؟ سیاست میں بلاشبہ اختلاف اور اتحاد کے دوائر بدلتے رہتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ملک و ملت کے بہی خواہوں نے قوم و وطن کے بدخواہوں سے اتحاد کرنا گوارا کیا ہو۔ اس کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ جن لوگوں کو ملک و ملت کا بدخواہ کہہ کر بدنام کیا جا رہا ہے وہ ان کے حقیقی خیر خواہ ہوں مگر برسرِ اقتدار طبقہ کی ہاں میں ہاں ملانے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے ہوں یا برسرِ اقتدار طبقہ ملک و ملت کے مفاد کے بارے میں اتنا بے حس ہو کہ وہ اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر ہر اُس فرد یا گروہ کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہو جو اس معاملے میں اس کا کچھ بھی معاون ثابت ہو سکتا ہو۔

جب حالات یہ ہوں تو ملکی سالمیت کے کسی آرڈیننس کے بارے میں عوام کے اندر مختلف قسم کے شکوک

کا پیدا ہونا بالکل قدرتی امر ہے اور انہیں اگر اس سلسلے میں یہ خدشہ لاحق ہو کہ یہ آرڈیننس ملکی سالمیت کے لیے نہیں بلکہ مسندِ اقتدار کے تحفظ کے لیے جاری کیا گیا ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ کسی ملک یا معاشرے میں قانون کا اجرا اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ایک خاص نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس نظم و ضبط کی نوعیت اور اس کا مزاج کیا ہو اس کا دارومدار اُن آرزوؤں اور امنگوں پر ہوتا ہے جن کی تکمیل کے لیے کوئی قوم جلتی اور جدوجہد کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو قانون کی حیثیت ان تحفظات کی سی ہے جو کسی شاہراہ میں پُرخطر مقامات پر نصب ہوتے ہیں تاکہ گزرنے والے افراد اور قافلوں کو نہ صرف خطرات کے مہیب غاروں سے بچایا جائے بلکہ انہیں صحیح راہ پر اور ٹھیک سمت کی طرف گامزن ہونے میں بھی مدد دی جائے۔ قانون اپنے اندر ایجابی اور سلبی دونوں پہلو رکھتا ہے ایک طرف اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کا محاسبہ کرے جو کسی معاشرے کی اساسی اقدار کو نقصان پہنچانے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ذریعہ بنتے ہیں تو دوسری طرف اس کا کام ان گزرگاہوں کی حفاظت اور پاسبانی بھی ہے جن پر چل کر کوئی قوم منزلِ مقصود تک پہنچتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی قوم منزلِ مقصود کا واضح تعین کیے اور اس تک پہنچنے کے لیے قومی امنگوں اور آرزوؤں کا مناسب زادِ سفر فراہم کیے بغیر محض قانونی شکنجوں کے بل بوتے پر ایک قوم بن سکتی ہے۔ قانون کی حیثیت جیسے کہ ہم نے پہلے عرض کی ہے راستے کے تحفظات کی ہے۔ اگر جادہ و منزل ہی متعین نہ ہوں اور کسی مخصوص راہ پر اور مخصوص منزل کی طرف گامزن ہونے کی آرزو پیدا کرنے کا کوئی التزام ہی نہ ہو تو پھر قانونی شکنجوں کی اس کے علاوہ اور کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ جو مسندِ اقتدار سنبھالنے کی وجہ سے ان شکنجوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ انہیں اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے جس طرح چاہے استعمال کرتا رہے۔ اگر اس ملک کا تحفظ اور اس ملت کی سلامتی ہمارے حکمرانوں کو فی الحقیقت عزیز ہے اور وہ اس کی سچی تڑپ اور آرزو بھی رکھتے ہیں تو پھر انہیں محض قانونی جکڑ بندیوں کا سہارا لینے اور ان پر اعتماد کرنے کے بجائے اس مقصد کے لیے بعض ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں۔ کسی ملک اور ملت کی تشکیل بڑا صبر آزما کام ہے اور اس کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے مگر ہم جن نازک حالات سے گزر رہے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند باتیں بالکل ناگزیر ہیں اور اگر اب بھی ملک کے برسرِ اقتدار طبقے نے اُن کی طرف پوری سنجیدگی سے توجہ نہ دی

اور سیاسی میدان میں اپنے حریفوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے ہی میں اپنی قوت و طاقت کھپاتا رہا تو پھر اس ملک کو کوئی چیز بھی تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات جو علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس خطۂ پاک میں قوت و طاقت کے اس لازوال سرچشمہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے جو باشندگانِ ملک کے مختلف اور متضاد عناصر کو باہم جوڑ کر ایک قوم بنا سکتا ہے۔ اگر آپ محض وطنیت کی اساس پر پاکستانی عوام کو ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو آپ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں جس کا جتنی جلدی ازالہ کر دیا جائے اتنا ہی آپ کے حق میں اور ملک و ملت کے حق میں مفید ہو گا۔ تحریکِ پاکستان جس کے نتیجے میں یہ ملک معرضِ وجود میں آیا وہ مغرب کے تصورِ وطنیت کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی اور اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ قومیں اوطان سے نہیں بلکہ افراد کے اساسی تخیلات، ان کی اقدارِ حیات، ان کی اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں اور ان کی آئیڈیالوجی سے تشکیل پاتی ہیں۔ اگر وطن کی اساس پر ہی پاکستانی قومیت کی تشکیل کرنا مقصود تھا تو پھر اس نیم برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطۂ ارض کا مطالبہ اپنے اندر کوئی معنویت نہ رکھتا تھا۔ مطالبۂ پاکستان میں جو جان اور معنویت تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ ہم دنیا کے سامنے یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ مسلم قوم بحیثیتِ قوم اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی صورت گوارا نہیں کر سکتی جو اس کے دینی تصورات سے مغائرت رکھتی ہو۔ اس کے نزدیک امورِ مذہبی اور امورِ دنیا کے مابین کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی بلکہ اس کا دین جس کی پیروی کی وہ دعویدار ہے وہ ان دونوں پر یکساں طور پر محیط ہے۔ دین کے اس ہمہ گیر، انقلاب انگیز اور حیات آفرین تصور نے پاکستان اور پاکستانی قومیت کو اساس فراہم کی۔ یہ اس تصور ہی کا اعجاز تھا کہ ہندوستان کے وہ مسلمان جنہیں اس امر کا پورا یقین تھا کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد وہ یکسر ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں گے اور دنیاوی نقطۂ نظر سے ان کا مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا انہوں نے پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ وہ ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے کے باوجود تصورِ پاکستان سے سرشار اور اپنے آپ کو پاکستانی قومیت کا جزو لاینفک سمجھتے ہوئے اس ملک کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لیے آمادہ رہے۔ دین کا وہ تصور جس کے صدقے میں یہ ملک معرضِ وجود میں آیا ہوا اور جس کی

روایات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر چکی ہیں اس سے اگر ملکی و ملی تحفظ کا کام نہ لیا گیا تو اور کون سی بنیاد اس کام کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

مگر یہ ہماری انتہائی بد قسمتی ہے کہ وہ دین جس کی وجہ سے ہمیں ایک الگ خطۂ ارض حاصل ہوا، جس نے ہمارے اندر اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا جذبہ و آرزو پیدا کی اس سے ہم نے ہمیشہ مجرمانہ تغافل برتا اور اس بات کی ہر لحظہ کوشش کی کہ خیر و برکت اور قوت و طاقت کے اس اتھاہ سمندر سے نہ صرف یہ کہ خود فائدہ اٹھانے سے گریز کیا جائے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے باز رکھا جائے اور صرف عوام کے جذبات سے کھیلنے یا انہیں بے وقوف بنانے کے لیے کبھی کبھی اس کا نام عقیدت و احترام سے لے کر انہیں یہ تاثر دینے کی کوشش کی جائے کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اگر اسلام کو فی الحقیقت ہماری اجتماعی زندگی کی اساس بنایا جاتا تو ہماری ملکی و قومی سالمیت کو وہ خطرات پیش نہ آتے جو اب اسے آرہے ہیں اور جس کے نتیجہ میں نصف سے زیادہ پاکستان ہندو استعمار کے قبضے میں چلا گیا ہے اور باقی نصف جو رہ گیا ہے وہ بھی شدید خطرات کے نرغے میں گھرا ہوا ہے۔ اگر اس ملک کا موجودہ حکمران طبقہ ان خطرات سے ملک کو بچانا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اس دین کے بارے میں اپنے آپ کو یکسو کرنے کی ضرورت ہے جو اس ملک و قوم کے لیے شہ رگ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور جسے ذرا سا گزند پہنچنے سے یہ ملک تباہ ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ سخت نادان ہیں جو ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار چلے آرہے ہیں کہ وہ دین سے غفلت برت کر محض آرڈیننسوں کی قوت سے اس ملک کو مستحکم اور مضبوط بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ غالباً ان کی اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ اسلام سے تعلق خاطر کے دعوے اور ملکی سالمیت کے تحفظ کی آرزو رکھنے کے باوجود وہ دین کے معاملے میں یکسو نہیں ہو سکے۔ وہ خود بھی اور ان کے یمین و یسار جو لوگ موجود ہیں وہ بھی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں جنہیں سن کر اس بات کا قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ کس منزل کی طرف بڑھنے کا عزم اور ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے ہاں اس وقت ملک میں جو دستور نافذ ہے اس کی رو سے ہمارے ارباب بست و کشاد اس بات کے پابند ہیں کہ وہ ملک کی اجتماعی زندگی کو جہاں تک جلد ممکن ہو اسلامی سانچوں میں ڈھالیں تاکہ قوم کے مختلف اجزاء کے مابین فکر و نظر کی ہم آہنگی اور عمل کی یکسوئی پیدا ہو۔ اگر اس سمت کی طرف کوئی قدم اٹھایا جاتا تو (باقی بر صفحہ ۴۵)

آغازِ رسالت

بعثت سے قبل انبیاءؑ کا ذہنی سفر قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ۔ ۵۲)	اے نبی تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ۔ ۷)	اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا پھر تمہیں راستہ بتایا۔

عقلی معرفت سے الہامی ایمان تک اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے اُنہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے، وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر اُن کا دل گواہی دیتا تھا، اب اُنہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور اُنہی صداقتوں کا مشاہدہ اُنہیں کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے اُن کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار تکرار بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً۔ (آیت۔ ۱۷)	پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا۔ (یعنی عقل و فطری ہدایت پر)، اُس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن)، اور اُس سے پہلے موسےٰ کی کتاب بھی رہنما

اور رحمت کے طور پر موجود تھی۔ (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کرسکتا ہے؟)

پھر اس کے بعد یہی مضمون حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۔

(آیت - ۲۸)

اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اُس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی و نبوت) سے بھی نوازا اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم زبردستی اُسے تمہارے سر چپیک دیں؟

بینۃٌ من الربّ پھر اسی مضمون کو آیت ۶۳ میں حضرت صالح اور آیت ۸۸ میں حضرت شعیب دُہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں "بینۃٌ من الرب" سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید اور معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر اور عقلِ عام (COMMON SENSE) کا استعمال اُن قیاس آرائیوں اور اُس تخرص و تخمین (SPECULATION) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اس طرح آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اوّل ص ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ قبل نبوت کے جو حالات ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نبی ہونے سے پہلے ہی شرک سے پاک اور توحید کے قائل تھے۔ آپ نے ہوش

سنبھالنے کے بعد کبھی اپنی قوم کے مشرکانہ عقائد کو قبول نہیں کیا، اس کی مشرکانہ عبادات میں حصہ نہیں لیا، بتوں اور بت پرستی سے ہمیشہ بیزار رہے، اور بتوں پر جو قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ان سے اجتناب فرماتے رہے۔ زمانۂ قبل نبوت میں آپ کا حال اپنی قوم کے ان حُنفاء سے ملتا جلتا تھا جن کا ذکر ہم اس جلد کے دوسرے باب میں کر چکے ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

حضورؐ کا دورِ تحنُّث محدثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروہ بن زُبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں[۵۱]۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حراء میں رہ کر عبادت کرنے لگے[۵۲]۔ (حضرت عائشہؓ نے تحنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہری نے تعبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق)

غارِ حراء میں خلوت گزینی کی وجہ اس دور میں جن وجوہ سے آپؐ مکہ کی آبادی کو چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حراء کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے اس کے وجوہ پر کچھ روشنی سورۂ الم نشرح کی اس آیت سے پڑتی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيٓ اَنْقَضَ — اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ

---

۵۱ بیہقی کی روایت ہے کہ یہ کیفیت نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ (اضافہ از مؤلف)

۵۲ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت کے بعد آپ اور زیادہ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ ورنہ آپ کی خلوت پسندی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ حراء میں گزارتے۔ چند روز کا سامانِ خوراک لے کر جاتے، پھر گھر واپس آ کر مزید چند روز کا سامان لے جاتے تھے۔ ابن اسحاق نے یہ بیان نہیں کیا کہ حضورؐ نے حراء میں جا جا کر قیام فرمانے کا یہ سلسلہ کب سے شروع فرمایا تھا۔ (اضافہ از مؤلف)

ظھرک (آیات ۲-۳) اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔

اس آیت میں وِزر کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپ کُڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِس رہنمائی نے آپ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ (تفہیم القرآن جلد ششم، الم نشرح، حاشیہ ۲)

سچے خواب جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی زمانۂ نبوت کے ہر دور میں جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح آیت ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث قُدسیہ زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۴)

ابتدائے وحی جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوگئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ پر غارِ حراء میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہوگئی تو آپ نے فرمایا "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے" پھر سارا قصہ آپ نے اُن کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"ؐ انھوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم، آپ

سلہ ابن اسحاق نے عُبَید بن عمر اللَّیثی سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خواب میں جبریلؑ نے آکر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہوئی تحریر مجھے دکھائی جس میں سورۂ علق کی ابتدائی آیات لکھی ہوئی تھیں اور مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر انھوں نے مجھے اس طرح بھینچا کہ میں سمجھا کہ میری جان نکل جائے گی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو۔ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ گویا تمہید تھی اُس معاملہ کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا، جس کا ذکر حضرت عائشہؓ والی حدیث میں آیا ہے۔ (اضافہ از مؤلف)

سلہ اس خوف کے بہت سے وجوہ علماء نے بیان کیے ہیں جن کی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے، مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کے بارِ گراں کا تصور کر کے حضورؐ لرز جاتے تھے اور آپ کو بار بار خیال آتا تھا کہ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنے آپ کو کوئی بڑی ہستی نہ سمجھتے تھے اور کوئی ایسا ادعا آپ کے ذہن میں نہ تھا کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہی ہونا چاہیے اور کوئی زعم آپ کو نہ تھا کہ میں ہی یہ عظیم کام انجام (باقی بر صفحہ آئندہ)

کو اللہ تعالیٰ کبھی رُسوا نہ کرے گا[۱]۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔"

حضرت خدیجہؓ آپ کو وَرَقہ بن نَوفَل کے پاس لے جاتی ہیں پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نَوفَل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، زمانہ جاہلیت میں بُت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیے[۲]۔ (ابو نُعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود سارا قصہ ورقہ کو سنایا) وَرَقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا[۳]۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وَرَقہ نے کہا ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وَرَقہ کا انتقال ہو گیا۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق)

اس واقعہ سے کیا نتائج نکلتے ہیں یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دینے کی قوت و اہلیت رکھتا ہوں۔ (اضافہ از مولف)

۱۔ ایک روایت میں الفاظ ہیں اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رنج میں مبتلا نہ کرے گا۔ (اضافہ از مولف)

۲۔ حضورؐ کو اُن کا بھتیجا اس لیے کہا کہ ان کی تیسری پُشت میں عبدالعُزّیٰ حضورؐ کی چوتھی پُشت میں عبدمُناف کا بھائی تھا۔ (اضافہ از مؤلف)

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے تو نبوت کی بشارت پیدائش سے بھی پہلے دے دی گئی تھی، البتہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت اُسی طرح اچانک ملی جس طرح حضورؐ کو دی گئی (اضافہ از مؤلف)

کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تأثر آپ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے ان کو غارِ حراء میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تأمل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی بول اٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۃ العلق)

صورتِ واقعہ کا تجزیہ نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی، نہ اس کے لیے کوئی تیاری آپ پہلے سے کر رہے تھے اور اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے۔ لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس حالت میں جب یکایک غارِ حراء کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر اس پہلے

عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پر طاری ہونی چاہیے، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنھوں نے طبعِ مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا؟[۱] لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمھاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں، اب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپؐ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔

پہلی وحی پر ردِ عمل اسی وجہ سے جب آپؐ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ "مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو" گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھہرا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا، اور فرمایا:

"لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِىْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔

انھوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ:

كلا واللّٰه ما يخزيك اللّٰه ابدًا۔ انك لتصل الرحم وتصدق الحديث وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق۔

ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آپؐ کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں، اور تمام نیک

---

[۱] بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عُجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب آپؐ نبوت کے منصبِ عظیم پر یکایک مامور کر دیے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لیے رب کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑے۔ (رسائل و مسائل، حصہ سوم ص ۲۳۲)

کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ اُنھوں نے حضورؐ سے کیفیت سن کر بلاتامل تصدیق کی کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے جوانی تک آپؐ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انھوں نے اِس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیماتِ انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور سچی نبوت ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۲۹ تا ۲۳۲)

اگر پہلے سے شوقِ نبوت ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے تو غارِ حراء والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غارِ حراء کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے؟

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دُکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر

حقیقت ہے۔ اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی تھا۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنّع سے مُمیّز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی، بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپ کی زبان سے حراء کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامّل اس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریب نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیل نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔[۱]

(تفہیم القرآن جلد سوم، القصص حاشیہ ۱۰۹)

پہلی وحی کا مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

> "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا۔ اس پیغام میں آپ کو یہ نہیں بتایا گیا

---

[۱] مثلاً سورۂ یونس کی آیت قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم۔۔۔ الخ
نیز سورۂ شوریٰ کی آیت ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان۔۔۔ الخ مرتب

تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں، اور آگے کیا کچھ آپؐ کو کرنا ہے۔ بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربہ سے ہوا ہے اس کا اثر دور ہو جائے، اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں[۵۱]۔ (تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ مدثر)

یہ پہلی وحی جو حضورؐ پر نازل ہوئی اس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ " پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ (العلق۔ آیت ۱)

فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو! تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپؐ اسی طرح پڑھتے جائیں، تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں[۵۲]۔

"اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو" یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظِ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ کا رب کون ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

"جس نے پیدا کیا"۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے

۵۱۔ اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلق خدا کو اُس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل آگے آئے گی۔ (اضافہ از مؤلف)۔

۵۲۔ سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ "جبریلؑ نے لا کر ایک ریشمی تھیلی حضورؐ کے سامنے پیش کی جس میں ایک تحریر تھی، اور کہا کہ پڑھو" (حاشیہ از مؤلف)

کہ اس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (آیت۔۲) جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتداء کرکے اسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق، جمع ہے عَلَقَہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔[۱]

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (آیت۔۳-۴) پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

یعنی یہ اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتداء کرکے اس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ (آیت۔۵) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اسی پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیۃ الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ:

"وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ" اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷

وہ خود چاہے" (البقرہ ۔ ۲۵۵)

جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہ راست مخاطب ہے، اس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس سے ایک مدت بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے۔[1] (باقی)

(تفہیم القرآن، جلد ششم، العلق، حواشی ۱ تا ۶)

[1] مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ المدثر

لیبیا میں سرقہ وحرابہ کی حدود کا قانون

(۳)

(از جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضاء لیبیا)

بسلسلہ دفعہ ۲۱

(۳) ہاتھ رسغ (گٹے، پہنچے) پر سے کاٹا جائے گا، جہاں ہاتھ کا جوڑ ہوتا ہے، اور پیر مفصل (ٹخنے) پر سے۔[1]

(۴) مقطوع شخص طبی نگرانی میں اس وقت تک رہے گا جو مدت وہ سرجن متعین کرے جس نے آپریشن کیا ہے۔ یہ نگرانی ہسپتال میں یا اس کے باہر دونوں جگہ ہوگی، اس کے لیے تمام احتیاطی تدابیر کی جائیں گی، اور ضروری علاج فراہم کیا جائے گا کہ دوسری محتمل تکلیفیں یا نقصانات پیش نہ آجائیں۔[2]

---

[1] یہ تقریباً جمہور فقہائے اہل سنت کی رائے ہے۔ ابو ثور اور امام احمد کا ایک قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ پیر اس طرح کاٹا جائے گا کہ ایڑی کا حصہ بچ جائے، مزید تفصیل سرقہ وحرابہ کی مفصل بحث میں کروں گا۔

[2] یہ تمام احتیاطی تدبیریں ضروری اور شرعی ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود ہے۔" فاقطعوہ واحسموہ" حسم کے معنی یہ ہیں کہ خون بہنے والی رگوں کو گرم لوہے سے داغا جائے۔ یا المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ گرم تیل میں ڈالا جائے تاکہ خون نہ بہے۔ امام شافعی اور احمد کے نزدیک حسم کرنا مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور اس کی دلیل اور ضرورت فقہ حنفی کی کتابوں میں اس طرح درج ہے کہ "اگر حسم نہ کیا جائے گا تو ہلاکت اور تلف کی نوبت آجائے گی اور حد زاجر ہوتی ہے نہ کہ متلف۔ اس قول اور دلیل کی رو سے احتیاطی تدابیر نہ صرف یہ کہ مستحسن ہیں بلکہ واجب ہیں تاکہ مزید نقصان، امراض یا موت واقع نہ ہو جائے۔ لیبی مقنن نے اسی انسانی اور شرعی حکمت کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ عصور اولیٰ میں خون روکنے اور نقصانات سے بچانے کا بہترین طریقہ وہی رائج تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ روح شریعت مصلحت شریعت اور تقاضائے شریعت یہی ہے کہ ہر زمانے میں بہترین اور جدید ترین احتیاطی طریقے استعمال کیے جائیں۔ اس لیے ڈاکٹر، سرجن، ہسپتال، دوائیں اور (باقی صفحہ آئندہ)

دفعہ ۲۲۔ قطع سے متعلق خاص احکام

(۱) چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اگرچہ وہ مشلول ہی کیوں نہ ہو، یا انگوٹھا کٹا ہوا ہو، یا انگلیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) نگرانی سب شرعی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مستحسن اور مستحب ہیں بلکہ ضروری اور واجب ہیں۔ لیبیا میں علاج مفت ہے اور ہر باشندہ کو مفت علاج کی سہولتیں مہیا ہیں۔ جن ملکوں میں یہ سہولتیں عوام کے لیے مفت نہ بھی ہوں، وہاں بھی ان طبی احتیاطوں اور دواؤں کی قیمت حکومت ہی پر عائد ہونی چاہیے۔ خدا بھلا کرے ائمہ فقہ کا کہ جزئیات تک پر بحث کر چکے ہیں۔ حسم کرنے کے سلسلے میں داغنے یا تیل وغیرہ کی قیمت کون ادا کرے گا؟ احناف کے نزدیک اس کی قیمت چور ادا کرے گا کیونکہ مجرم وہ ہے، اور امام شافعی و احمد کا قول یہ ہے کہ بیت المال اور حکومت ادا کرے گی، حالانکہ حسم ان کے نزدیک واجب نہیں صرف مستحسن ہے اور احناف کے نزدیک واجب ہے۔ دونوں اقوال اپنے مخصوص زاویہ نظر اور انداز فکر کی وجہ سے صحیح ہیں، لیکن دوسرا قول فطری اور انسانی جذبات کی روشنی میں اَصح ہے۔

طبی سہولتوں کا تذکرہ بیان آگیا، اس لیے راقم ایک اجتہادی مسئلہ مختصر طور پر فقہاء و مجتہدین امت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہے؟ اور اس کا کیا کیا جائے؟ کیا یہ حکومت کی ملکیت ہے کہ اس کو بازار یا مسجد کے دروازہ پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو؟ یا دفن کر دیا جائے کہ جسم انسانی کی حرمت کا تقاضا پورا ہو؟ یا یہ مقطوع کی گردن میں ڈال دیا جائے کہ حاضرین جو قطع کے مشاہدہ کے بعد تاثر اور انفعال کی کیفیت سے لبریز ہو چکے ہوں وہ اس مقطوع ہاتھ کو اس کی گردن میں لٹکا ہوا دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں؟ یا یہ ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہو؟

مالکی مفسر ابو عبداللہ القرطبی لکھتے ہیں: "تعلق ید السارق فی عنقه، قال عبد الله بن محیریز سألت فضالة عن تعلیق ید السارق فی عنقه، امن السنة هو؟ فقال، جیئ رسول الله صلی الله علیه وسلم بسارق فقطعت یده ثم امر بها فعلقت فی عنقه، اخرجه الترمذی وابوداؤد والنسائی" (تفسیر القرطبی ۶-۱۷۲)۔

امام شافعی اور احمد کے نزدیک بھی یہ سنت ہے۔ اس کی طرف اشارہ اور احناف کا مسلک ابن ہمام اس طرح واضح کرتے ہیں: ویسن تعلیق یده فی عنقه لانه علیه السلام امر به و (باقی بر صفحہ آیندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ "، وعندنا ذلک مطلق للامام ان رآہ ولم یثبت عنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فی کل من قطعہ لیکون سنۃ" (شرح فتح القدیر ۴ - ۲۴۸) -

اس اختلاف فقہی کا ماحصل یا نتیجہ یہ نکلا کہ احناف کے نزدیک قطع سے زجر مکمل ہو گیا، اب مزید زجر گردن میں ہاتھ لٹکانے سے واجب یا سخت موکد نہیں ہے - دوسری بات یہ کہ اگر امام چاہے تو مزید زجر کے لیے گردن میں ہاتھ حدیث کی رو سے لٹکا سکتا ہے - لیکن دونوں صورتوں میں سے کسی کو بھی مان لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے قطع ید اور اس کو گردن میں حمائل کر دینے کے بعد اب مزید کسی زجر کی نہ ضرورت ہے اور نہ حکمت - اب سوال طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کسی بھی صورت سے زجر مکمل ہو جانے کے بعد یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہو گا؟

عصور اولیٰ میں اس ملکیت اور عدم ملکیت سے نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی - نص کی موجودگی میں اور شریعت کی روح کے خلاف اجتہاد ناجائز بھی ہے - لیکن روح شریعت کے موافق اجتہاد اور غور و خوض نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحسن اور بعض اوقات ضروری ہے - حد کے متعلق یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ وہ گناہ سے باز رکھنے اور تادیب و تخویف اور زجر کے لیے رکھی گئی ہے - چور کی تادیب اس طرح ہو گئی کہ اس کا ہاتھ کٹ گیا، اور عوام الناس کے لیے تخویف و تاثیر کا باعث یہ ہو گیا کہ انہوں نے اس کے قطع کا اندوہناک اور اثر انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اس کا ہاتھ خدا کی حد کو توڑنے اور عصیان کی وجہ سے اس کی گردن میں پڑا ہوا بھی انہیں نظر آ گیا، اور اس کارروائی سے مکمل طور پر شریعت کا مقصود پورا ہو گیا -

علم طب کی روز افزوں ترقیاں اور آپریشن کے جدید طریقوں میں محیر العقول - - لیکن محیر القلوب نہیں بلکہ مقلب القلوب تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اور "سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق" (فصلت - ۵۳) کی قرآنی صداقت سائنس و طب کی تجلیوں میں نمودار ہونے کے لیے بیقرار ہے، اور اسلام علم کے سارے فوائد اور سائنس و طب کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں مسلمانوں کے لیے کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے اصولوں اور شریعت کی روح کے مخالف اور منافی نہ ہوں -

اس صورت حال کے پیش نظر ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی کی اس بیان کردہ حدیث اور مسئلہ پر نظر ڈالیں جو راقم نے فتح القدیر اور قرطبی سے نقل کیا ہے - اور اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ مقطوع ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہے جس کے جسم سے وہ کاٹا گیا ہے تو پھر اس کے لیے طب کی ان سہولتوں اور (باقی بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کم یاب سہی لیکن کامیاب تجربوں سے مدد لینی جائز ہے یا نہیں جن کی رو سے کٹے ہوئے ہاتھ پیر دوبارہ جوڑے جانے اور سیدھا ہاتھ الٹی جگہ پر اور الٹا ہاتھ سیدھی جگہ پر جوڑے جانے کے کامیاب تجربے اور قصے ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں؟ قطع کے سلسلے کی ساری طبی سہولتیں تو گورنمنٹ کو دینی ضروری ہیں، لیکن اگر یہ طبی آپریشن فقہی طور پر جائز ہو تو اس پر خرچ کی جانے والی رقم یا سہولتیں حکومت پر ہرگز ضروری نہیں ہوں گی۔ بلکہ یہ رقم مجرم کو اپنے پاس سے خرچ کرنی ہوگی یا اس کے اعزہ، اقرباء اور دوست احباب اگر چاہیں تو اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ممکن ہے کہ اس طرح مجرم اور سوسائٹی دونوں میں جرم سے اجتناب اور خوف کم ہو جائے گا، اور اس طرح شریعت کی حکمت پوری نہیں ہو سکے گی۔ یعنی حد زاجر نہ رہ جائے گی۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ محض ایک فرضی اعتراض ہوگا، کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ شریعت کی پہلی حکمت، یعنی مجرم کو سزا، وہ تو پوری ہو گئی۔ دوسری حکمت یعنی سوسائٹی اس سے سبق سیکھے وہ بھی پوری ہو گئی۔ تیسری بات یہ کہ یہ آپریشن تو ابھی کمیاب ہے اور تجربہ کی دنیا میں ہے اور بہت مخصوص ملکوں میں ہے۔ لیکن کوئی سا بھی معمولی سے معمولی آپریشن سو فیصد کامیاب ہونے کی گارنٹی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور یہ کہنا کہ اس طرح چور بار بار چوری کرے گا اور آپریشن کرا لیا کرے گا، ایک محال مفروضہ ہے۔ کیونکہ عام انسان اُن آپریشنوں تک کو بلا وجہ بلا ضرورت اور بلا خوف نہیں کراتے جن کی کامیابی کا علم تجربہ کی رو سے بار بار ثابت ہوتا رہتا ہے، اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ معمولی سے آپریشن تک میں جان تک جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس لیے چور محض اس آپریشن کی تسلی میں دوبارہ چوری کرنے کی جرأت راقم کے خیال میں ہرگز عام حالات میں نہیں کر سکتا۔ اور یوں تو پھر ایک ہاتھ ضائع ہو جانے کے بعد بھی دوبارہ چوری کرنے والے اور دوبارہ ان پر قطع کی حد نافذ ہونے والے ہزاروں ہزار میں ایک دو مل ہی سکتے ہیں۔ میرے خیال میں نہ کوئی دوسرا سوسائٹی کا وہ شخص جو چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس سہولت کی وجہ سے چوری کا ارادہ کرے گا، کیونکہ اس سہولت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی جسے چوری کرنی ہوتی ہے وہ قطع ید جیسی سخت سزا کی موجودگی میں بھی یہ کام کرتا ہے، اور نہ کوئی صالح شخص اس آپریشن کی سہولت مہیا ہونے کے بعد بخوشی اور بلا خوف یہ کام شروع کر دے گا۔ علاوہ فطرت بشری کے اصولوں کے بھی یہ بات قابل غور ہے کہ یہ آپریشن نہ ہر صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے، نہ ہر ملک میں ہو سکتا ہے، اور اس پر ہزاروں کے مصارف آ سکتے ہیں، کسی بھی چور کے لیے سو فیصد کامیابی کا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہزاروں روپیہ برباد کرنے کے بعد ایسی مشتبہ و مشکوک، خطرناک اور غیر یقینی کامیابی کا سہارا لے کر کوئی شخص بہوش و حواس چوری کا ارادہ کر سکتا ہے؟ ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) "فَاقْطَعُوٓا"۔ کی نص میں قطع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے، لیکن اس ظاہر نص کی روشنی میں ہمیشہ فقہاء نے حدیث و اقوال صحابہ کی مدد سے احکام کے استنباط کیے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات صحیح ہے کہ نص میں قطع کا قطعی حکم ہے اور اس کی قطعیت سے انکار نعوذ باللہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، مگر حاکم کے حکم سے جب قطع ہو گیا تو اس حکم کا منشاء پورا ہو گیا۔ ایک وقیع اشکال راقم کے نزدیک یہ ضرور ہے کہ اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ چور ہمیشہ اپنے ہاتھ سے محروم رہے تاکہ یہ اس کے لیے نکال اور عبرت ہو، اور جو شخص اس کو دیکھے اس کے لیے بھی چوری سے باز رہنے کا ذریعہ ہو، اگر ایسا ہو تو پھر یہ آپریشن صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن آیت قرآنی قطع کو بدلہ بتاتی ہے" جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ" اور نکال کے معنی قرطبی یہ لکھتے ہیں" نکلت به اذا فعلت به ما یوجب ان ینکل به عن ذلك الفعل" (۶-۱۷۴) (ایسا فعل کرنا جس سے آدمی اس فعل سے باز رہے) اور یقیناً قطع ید ایسی سخت سزا ہے جو بیک وقت جزا اور نکال کا کام دیتی ہے۔ آیت کے آخر میں ہے "فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ" تابعی عطاء اور امام شافعی کے ایک قول میں توبہ قطع تک کو ساقط کر دیتی ہے۔ آ گیا، جزا، نکال اور توبہ و اصلاح کے بعد یہ آپریشن صحیح نہیں ہو سکتا؟ بہر حال اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ تا حیات چور پر حد کا اثر باقی رہے تو پھر اس مسئلہ پر بحث ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن راقم کے سامنے یہ نظیر ہے کہ عام حدود کے زاجر ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تا حیات ان کا اثر باقی رہے۔ زنا چوری سے زیادہ فحش کام ہے۔ اس کی حد کوڑے لگانا ہے، جن کا کوئی اثر تا حیات باقی نہیں رہتا۔ اگر تا حیات حد کا اثر باقی رکھنا ہی حد کی حکمت ہوتی تو پھر اس جرم میں عضو تناسل، خصیتین، یا اگر ان سے تناسل و توالد کی حکمت ختم ہونے کا خطرہ ہوتا تو کسی اور ایسے ظاہر عضو کو کٹوا دیا جاتا جس کو دیکھ کر دوسروں کو تا حیات عبرت حاصل ہوتی رہتی۔ شراب ام الخبائث ہے اس کی حد بھی کوڑے ہیں جن کا اثر تا حیات باقی نہیں رہتا، اور کسی کے لیے بھی ان سے تا حیات عبرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حدود اسلامیہ کے عبرت آموز اور اثر انگیز ہونے کے لیے ان کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے، اور پھر ان کا نفاذ مسلمانوں کے مجمع میں ایک بار اس کی پوری ضمانت ہوتا ہے کہ ان کا اثر دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے۔

بہر حال راقم نہ تو اس مسئلہ کو جائز کرنے ہی کے درپے ہے، اور نہ اس سلسلے میں کوئی فتویٰ دینا چاہتا کہ یہ مجھ جیسے ناقص علم و تجربہ والے کا کام نہیں، اور نہ کسی ایک عالم کے لکھنے سے اس مسئلہ میں کوئی قول فیصل ہو سکتا ہے، بلکہ یہ علمائے امت کی اکثریت کی رائے اور اجتہاد کی روشنی میں مفروض بحث (باقی بر صفحہ آئندہ)

کٹی ہوئی ہوں[51]۔ بشرطیکہ شل ہونے کی وجہ سے اس کے کاٹنے سے ہلاک ہو جانے کا خطرہ نہ ہو۔

(۲) چور کا ہاتھ حسبِ ذیل صورتوں میں نہ کٹے گا:

(الف) اگر اس کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا ہے، یا شل ہے، یا انگوٹھا کٹا ہوا ہے، یا اگر انگوٹھا کٹا ہوا نہ ہو تو (کوئی سی بھی) دو انگلیاں کٹی ہوئی ہوں[52]۔

(ب) اگر اس کا دایاں پیر کٹا ہوا ہے، یا شل ہے یا اس میں ایسا لنگ ہے جس کی وجہ سے اس پر چلا نہیں جا سکتا[53]۔

(ج) اگر اس کا دایاں ہاتھ چوری کے بعد کسی بھی حادثہ کی وجہ سے جاتا رہا ہو (کٹ گیا یا ٹوٹ گیا ہو)۔

(۳)۔ (مذکورہ بالا صورتوں میں کسی بھی وجہ سے) اگر قطع نہ ہو سکے تو مجرم کو سزا تعزیر کے طور پر قانون عقوبات (لیبیا) کے ماتحت دی جائے گی[54]۔

دفعہ ۲۲۔ جزئیات میں رجوع کہاں کیا جائے

امام مالک کے مذہب میں مشہور قول کی تطبیق کی جائے اُن چیزوں میں جن کے متعلق نص (حکم) اِس قانون میں وارد نہیں ہوئی ہے سرقہ اور حرابہ کے سلسلے میں جن پر حد واجب ہو گی۔ اور اگر مشہور (مذہب) میں نص نہ پائی جائے تو قانون عقوبات (لیبیا) کی تطبیق کی جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں آ سکتا ہے۔ راقم یہ مسئلہ صرف اسی لیے پیش کر رہا ہے کہ مشاہیر اہل علم و فضل جن میں اجتہاد کی اہلیت اور شرعی شرطیں پائی جاتی ہوں وہ مسئلے کو واضح کریں

[51] یہ احناف کا قول ہے۔

[52] یہ بھی احناف ہی کا قول ہے کہ اس طرح منفعتِ جنس ختم ہو جائے گی، ہاتھوں سے پکڑنے کی صلاحیت جاتی رہے گی۔

[53] یہ بھی احناف ہی کا قول ہے کہ اس طرح پیر سے چلنے کی منفعت ختم ہو جائے گی کہ جسم کی ایک شق یعنی ایک جانب سے ہاتھ اور پیر کاٹنے سے چلنا دوبھر ہو جائے گا، اور شریعت کی یہ حکمت حدِ حرابہ میں ظاہر ہوتی ہے جہاں قطع میں اختلاف کا حکم دیا گیا ہے، یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔

[54] قانون عقوبات میں وارد سزاؤں کا ترجمہ تفصیلی مضمون میں کروں گا۔

اور (حد کے) جاری کرنے کے طریقوں کے بارے میں اس قانون میں جہاں نص نہ ہو وہاں قانون اجراءاتِ جنائیہ (لیبیا) کی تطبیق کی جائے۔

اس قانون کے احکام قانون عقوبات یا کسی دوسرے قانون کے احکام کو لغو نہیں کرتے، اُن چیزوں کو چھوڑ کر جن کے بارے میں اس قانون میں نص موجود ہے۔

دفعہ ۲۴

تمام وزیروں کو چاہیے کہ اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں اس قانون کی تنفیذ کریں، اور اس قانون پر عمل کیا جائے سرکاری گزٹ میں چھپنے کے تیس دن بعد سے۔

انقلابی کونسل

عبدالسلام احمد جلود، وزیر اعظم

محمد علی الجدی

وزیر انصاف

۴ رمضان ۱۳۹۲ھ

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء

یہ قانون سرکاری گزٹ میں ۸ ذی القعدہ ۱۳۹۲ھ، مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۷۲ء کو وزیر عدل (انصاف) کے حکم سے شمارہ نمبر ۰۷ سال نمبر ۱۰ میں نشر کیا گیا ہے۔ توضیحی یادداشت بھی اسی شمارہ میں نشر کی گئی ہے جس کا ترجمہ راقم عنقریب پیش کرے گا۔ اس طرح اس قانون کا اجراء الحمد للہ ثم الحمد للہ لیبیا کی اسلامی سرزمین میں ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء سے ہو گیا ہے۔ راقم کی اطلاع کے مطابق تادم تحریر (یکم اپریل ۱۹۷۳ء) ابھی تک کسی کے ہاتھ کٹنے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ تین چوری کی وارداتیں پبلک پراسیکیوٹر کے پاس آئی ہیں، جن میں تحقیق جاری ہے کہ کیا ان میں حد کی شرط پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر شرطیں نہ پائی گئیں تو تعزیری طور پر دوسری سزائیں ملیں گی، اور اگر شرطیں منطبق ہوئیں تو کیس عدالت میں پیش کیے جائیں گے، اور آخری فیصلے کے بعد اجرا ممکن ہوگا۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں لیبیا میں چوری کی وارداتیں دوسرے ملکوں کے بالمقابل بہت ہی کم ہیں۔ لیکن گزشتہ چند سالوں سے کچھ بڑھ رہی تھیں۔ ان شاء اللہ قانون شریعت کے احیاء اور حدود کے اجراء بلکہ اعلان ہی کے بعد بہت جلد یہ کم واقعات بھی معدوم ہو جائیں گے۔ "ایک حد کا قیام چالیس دن کی بارش اور اس سے جو خیر و برکت نازل ہوتی ہے اس سے بہتر ہے" (تفسیر قرطبی ۱۲-۱۶۶) کا مفہوم قلب مومن

تو ہمیشہ سے سمجھتا ہے اور مانتا بھی ہے لیکن عام انسانوں اور عالمی قانونِ جنایات کے ماہرین کی عقل و نظر بھی اس کی حقانیت کی مُقر ہو جائے گی۔ اور پھر جب کامل اسلامی نظام و قانون کی حکمرانی سارے اسلامی ملکوں میں زبان اور عمل سے شروع ہو جائے گی، کتاب و سنت کی پیروی مقصدِ حیات بن جائے گی اور خدا کی توحید اور رسولؐ کی محبت رگِ جان میں پیوست ہو جائے گی تو پھر فرحت و انبساط ہر خطہ میں نظر آئے گا۔ انسانی آبادی کو پرامن زندگی گزارنے کی کھوئی ہوئی سعادت پھر واپس مل جائے گی۔ اور چوری، سینہ زوری اور تمام اخلاقی گراوٹوں، اقتصادی پریشانیوں اور نفسیاتی آفتوں سے وہ محفوظ ہو جائے گی۔ امت اسلامیہ کو قوت، عظمت اور نصرت سب دوبارہ واپس مل جائے گی، اور خدا کی زمین نورِ شریعت سے معمور ہو کر قلوب انسانی کو تجلیات کا طور بنا دے گی۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ — اس دن تم مومنین اور مومنات کو

يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ — دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور

بِأَيْمَانِهِمْ" (حدید - ۱۲) — داہنے دوڑ رہا (پھیلا ہوا) ہو گا۔

لیکن شیاطین انس و جن، طاغوت کے پجاری، یعنی وہ منافقین جو مسلمانوں میں مل کر اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں، جن کے قول و فعل میں تضاد ہے، جن کے باطن اسلامی شریعت سے بیر رکھتے ہیں، خدا پر اعتقاد نہیں رکھتے، رسولؐ کی اطاعت نہیں کرتے اور قانون الٰہی کے نفاذ سے پریشان ہوتے ہیں، وہ سب اس دن نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوں گے۔ آیت قرآنی میں ان سے خطاب یوم قیامت کے سیاق میں کس قدر متاثر کر دینے والے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ اور جس طرح وہ زندگی میں نفاق کرتے تھے اور ظلمت حیات کو نورِ مستقیم کے مقابلہ میں انہوں نے اختیار کیا تھا، اسی کی مناسبت سے انہیں نور اور رحمت سے محرومی کی وعید سنائی جا رہی ہے، اور آخر میں پھر ایمان کامل کی دعوت، خشوع الٰہی کی ضرورت، اور منزّل من اللہ قانون کی پیروی کی اہمیت پر اہل ایمان کو اس طرح ابھارا ہے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ — جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں

لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ — اہلِ ایمان سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو

مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ — ہم تمہارے نور سے (کچھ) اقتباس کر لیں

فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ — (پل صراط کے اندھیرے میں)، ان سے کہا

بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ
الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ
الْعَذَابُ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ
مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ
فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ
وَارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ
حَتّٰى جَاۤءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ، فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ
مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ
مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ،
اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ
تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ "

(حدید - ۱۳ - ۱۶)

جائے گا اپنے پیچھے لوٹو اور روشنی ڈھونڈھو (یعنی دنیا میں واپس جا سکو تو چلے جاؤ کیونکہ وہ دار العمل تھی روشنی وہاں عمل سے جمع کی جا سکتی تھی، یعنی یہ کہ اب روشنی ملنی ممکن نہیں جیسے کہ دنیا میں واپس جانا ممکن نہیں)، پھر اُن کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔ وہ ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ جواب دیں گے تھے کیوں نہیں، لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا، اور گھات میں (مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں) لگے رہے، اور شک میں پڑے رہے، اور (باطل) امیدوں نے تم کو دھوکہ میں رکھا، یہاں تک کہ امر الٰہی (موت یا عذاب) آپہنچا، اور بہکایا تم کو اللہ سے غرور (شیطان یا دنیا) نے، سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کفار سے۔ تمہارا ٹھکانا آگ ہے، یہی تمہاری رفیق ہے، اور برا انجام ہے یہ۔ کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے خشوع (خوف اور یاد) حاصل کریں اور اس سے جو حق (سچا دین یا قرآن) اترا۔

ایک قادیانی مشنری کے مکتوب کا جواب

(از جناب ملک غلام علی صاحب)

(قادیانی گروہ ان دنوں اپنی مفسدانہ اور گمراہانہ سرگرمیوں میں بڑے زور شور سے منہمک ہے۔ پورے ملک کے طول و عرض میں ان لوگوں نے پوسٹر بازی اور تقسیم کتب کی ایک مہم جاری کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف افراد کو خطوط بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس طرح کا ایک خط میرے نام ڈاک سے آیا تھا اور ڈاک ہی سے میں نے اس کا جواب بھیج دیا تھا۔ قارئین کی دلچسپی اور افادیت کی غرض سے دونوں کو ترجمان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ غلام علی)

قادیانی مبلّغ کا خط

"آپ کی کتاب "خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ" زیر مطالعہ ہے۔ میں ترجمان القرآن میں بھی آپ کے مضامین کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ آپ صاحب علم، سنجیدہ، باوقار، وسیع الحوصلہ اور غیر متعصب انسان ہیں اور صحیح بات کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں خواہ وہ کسی کے خلاف ہو۔ میں نے ایم، اے کا امتحان دینے کے بعد کئی سال یورپ میں گزارے جہاں اسلام کی تائید میں مضامین لکھتا رہا۔ میری دلچسپی مذہبی امور، قرآن کریم اور حدیث سے رہی۔ ترجمان القرآن اور مولانا مودودی کی کئی کتابیں بھی پڑھیں۔ احمدیہ جماعت کا مذہب ہے کہ اللہ اس کے فرشتوں، تمام مومنوں کی ہزار لعنت لاکھ لعنت اس جماعت اور اس انسان پر جو رسول مکی و مدنی کو پوری شان کے ساتھ خاتم النبیین یقین نہیں کرتا اور افسوس اس شخص پر بھی جو احمدیوں کے اس عقیدے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ یہ

لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے"۔

(اس خط کے ساتھ "الفضل" کے چند تراشے بھی تھے جن میں مکر و فریب کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی کہ ختم نبوت کے باوجود اجرائے نبوت جائز و ممکن ہے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے اور بند کرنے والی مہر نہیں بلکہ نعوذ باللہ ڈاکخانے کی مہر ہیں جس کے ذریعے سے نبوت کی ترسیل و تقسیم ہمیشہ جاری رہے گی)۔

خط کا جواب

آپ کا خط اور اس کے ساتھ "الفضل" کے تراشے وصول ہوئے۔ آپ نے تراشے ارسال کرنے کی تکلیف ناحق اٹھائی۔ میں مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین کی تحریرات و نظریات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ۱۹۰۱ء میں مرزا غلام احمد نے نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے پہلے اگر مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا یا نبی ہونے سے انکار کیا تھا تو ایسا انکار دعوائے نبوت کے بعد معتبر نہیں رہا۔ ۱۹۰۱ء سے پہلے مرزا غلام احمد خود اس شخص کو کافر سمجھتے تھے جو نبی ہونے کا دعویٰ کرے۔ میں مرزا غلام احمد اور مرزا غلام احمد کی نبوت تسلیم کرنے والوں کو قطعی کافر اور خارج از دائرۂ اسلام سمجھتا ہوں۔

مرزا غلام احمد کی حیثیت صرف متنبیٔ کاذب ہی کی نہیں، اس کی بیشتر تحریریں لسانی اغلاط، کذب و افتراء، چاپلوسی، فحش کلامی اور دجل و تلبیس کا ادنیٰ نمونہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اسے نبی یا مسیح یا مجدد سمجھتا ہے اس کا ذہن نبوت و مجددیت کے ایک نہایت گھٹیا، پست اور ناقص تصور کا حامل ہے۔ میں مرزا غلام احمد کی ایک تصنیف کو بطور مثال پیش کرتا ہوں جس کا نام "شہادت القرآن" ہے۔ اس میں مرزا غلام احمد نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسے اللہ نے مسیح موعود اور مثیل مسیح بنا کر اپنی طرف سے ان مغربی اقوام کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا ہے جو دجال اور یاجوج ماجوج کی مصداق ہیں۔ اس کتاب کے اسّی سے زائد صفحات اس طرح کے دعاوی اور ان کے حق میں دلیل بازی کے لیے وقف ہیں۔ اس بلند آہنگی کے بعد آخر میں مرزا صاحب ایک باب باندھتے ہیں جس کا عنوان "گورنمنٹ کی توجہ کے لائق" ہے اس میں لکھتے ہیں:

گورنمنٹ کی توجہ کے لائق

"یہ عاجز صاف اور مختصر لفظوں میں گذارش کرتا ہے کہ بباعث اس کے کہ گورنمنٹ

انگریزی کے احسانات میرے والد بزرگوار مرزا غلام مرتضیٰ مرحوم کے وقت سے آج تک اس خاندان کے شامل حال ہیں اس لیے نہ کسی تکلف سے بلکہ میرے رگ و ریشہ میں شکر گزاری اس معزز گورنمنٹ کی سمائی ہوئی ہے۔ میرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وہ خدمات کسی طرح الگ ہو نہیں سکتیں جو وہ خلوص دل سے اس گورنمنٹ کی خیر خواہی میں بجالائے۔ انھوں نے اپنی حیثیت اور مقدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے دل اور نیک نیتی سے کسی کا خیر خواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔ سن ستاون کے مفسدہ میں جب کہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا تب میرے والد بزرگوار نے پچاس گھوڑے اپنی گرہ سے خرید کر کے اور پچاس سوار بہم پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ چودہ سوار سے خدمت گزاری کی اور انہیں مخلصانہ خدمات کی وجہ سے وہ اس گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ جناب گورنر جنرل کے دربار میں عزت کے ساتھ ان کو کرسی ملتی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی بڑی عزت اور دلجوئی سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے میرے بھائی کو صرف گورنمنٹ کی خدمت گزاری کے لیے بعض لڑائیوں پر بھیجا اور ہر ایک باب میں گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کی اور اپنی تمام عمر نیک نامی کے ساتھ بسر کر کے اس ناپائیدار دنیا سے گزر گئے۔ بعد اس کے اس عاجز کا بڑا بھائی مرزا غلام قادر جس قدر مدت تک زندہ رہا اس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بدل و جان مصروف رہا۔ پھر وہ بھی اس مسافر خانہ سے گزر گیا۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اب بھی بہت سے حکام انگریزیہ بقید حیات ہوں گے جنھوں نے میرے والد صاحب کو دیکھا اور ان کی مخلصانہ خدمات کو بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ منجملہ ان کے مسٹر گریفن ہیں جنھوں نے رئیسانِ پنجاب کے بارہ میں ایک کتاب بھی لکھی ہے اور اس میں میرے والد صاحب کا بھی خیر اور خوبی سے ذکر کیا ہے "

(پھر انگریزوں کی مدح و ثنا کرتے ہوئے مرزا غلام احمد نے آگے لکھا ہے):۔

" انگریز ایک ایسی قوم ہے جن کو خدا تعالیٰ دن بدن اقبال اور دولت اور عقل اور دانش کی

طرف کھینچنا چاہتا ہے، اور جو سچائی اور راستبازی اور انصاف میں روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں اور علوم جدیدہ اور قدیمہ کا تو گویا ایک چشمہ ہیں۔ اس لیے امید قوی ہے کہ خدا تعالیٰ یہ دولت[1] بھی انہیں دے گا، بلکہ میری دانست میں تو دلوں کو اندر ہی اندر دے دی ہے بہرحال حبیب کہ ہمارے نظام بدنی اور امورِ دنیوی میں خدا تعالیٰ نے اس قوم میں سے ہمارے لیے گورنمنٹ قائم کی اور ہم نے اس گورنمنٹ کے وہ احسانات دیکھے جن کا شکر کرنا کوئی سہل بات نہیں۔ اس لیے ہم اپنی معزز گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس گورنمنٹ کے اسی طرح مخلص اور خیرخواہ ہیں جس طرح کہ ہمارے بزرگ تھے۔ ہمارے ہاتھ میں بجز دعا کے اور کیا ہے۔ سو ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس گورنمنٹ کو ہر ایک شر سے محفوظ رکھے اور اس کے دشمن کو ذلت کے ساتھ پسپا کرے۔ خدا تعالیٰ نے ہم پر محسن گورنمنٹ کا شکر ایسا ہی فرض کیا ہے جیسا کہ اس کا شکر کرنا، سو اگر ہم اس محسن گورنمنٹ کا شکر ادا نہ کریں یا کوئی شر اپنے ارادہ میں رکھیں تو ہم نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کیا کیونکہ خدا تعالیٰ کا شکر اور کسی محسن گورنمنٹ کا شکر جس کو خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بطورِ نعمت کے عطا کرے درحقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ایک کے چھوڑنے سے دوسری کا چھوڑنا لازم آجاتا ہے۔ بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں کہ:

اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں سو یاد رہے کہ یہ سوال ان کا نہایت حماقت کا ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔ سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں، دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔

[1] یعنی دولتِ ایمان

اگرچہ سچ ہے کہ ہم یورپ کی قوموں کے ساتھ اختلاف مذہب رکھتے ہیں اور ہم ہرگز خدا تعالےٰ کی نسبت وہ باتیں پسند نہیں رکھتے جو انہوں نے پسند کی ہیں۔ لیکن ان مذہبی امور کو رعیت اور گورنمنٹ کے رشتہ سے کچھ علاقہ نہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں صاف تعلیم دیتا ہے کہ جس بادشاہ کے زیرِ سایہ امن کے ساتھ بسر کرو اس کے شکر گزار اور فرمانبردار رہو۔ سو اگر ہم گورنمنٹ برطانیہ سے سرکشی کریں تو گویا اسلام اور خدا اور رسول سے سرکشی کرتے ہیں۔ اس صورت میں ہم سے زیادہ بد دیانت کون ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ کے قانون اور شریعت کو ہم نے چھوڑ دیا...... اور یاد رہے کہ جس بادشاہ کے زیر سایہ ہم با امن زندگی بسر کریں اس کے حقوق کو نگاہ میں رکھنا فی الواقعہ خدا کے حقوق ادا کرنا ہے اور جب ہم ایسے بادشاہ کی دلی صدق سے اطاعت کرتے ہیں تو گویا اس وقت عبادت کر رہے ہیں۔ کیا اسلام کی یہ تعلیم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے محسن سے بدی کریں اور جو ہمیں ٹھنڈے سایہ میں جگہ دے اس پر آگ برسا دیں اور جو ہمیں روٹی دے اسے پتھر ماریں۔ ایسے انسان سے اور کون زیادہ بدذات ہوگا کہ جو احسان کرنے والے کے ساتھ بدی کا خیال بھی دل میں لاوے........ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ فساد ہوا اس میں بجز جہلاء اور بدچلن لوگوں کے اور کوئی شائستہ اور نیک بخت مسلمان جو با علم اور باتمیز تھا ہرگز مفسدہ میں شامل نہیں ہوا........ پھر ایسے شخص پر یہ بہتان کہ اس کے دل میں گورنمنٹ انگلشیہ کی مخالفت ہے اور اس کی کتاب کی نسبت یہ گمان کہ وہ گورنمنٹ کے مخالف ہے پرلے سرے کی بے ایمانی اور شرارت شیطانی نہیں تو کیا ہے۔ خیر خواہانِ سلطنت و پیروانِ مذہب اسلام ان یاوہ گو حاسدوں کی ایسی باتیں ہرگز نہ سنیں اور اس کتاب یا مولف کی طرف سے سوءِ ظنی کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دیں۔ گورنمنٹ سے تو ہم پہلے ہی مطمئن ہیں کہ وہ ان باتوں کو مؤلف کی نسبت ہرگز نہ سنے گی۔ بلکہ جو ان باتوں کو گورنمنٹ تک پہنچاوے گا اس کو اس دروغ گوئی پر سرزنش کرے گی۔"

"سو اس عاجز نے جس قدر حصہ سوم کے پرچہ مشمولہ میں انگریزی گورنمنٹ کا شکر ادا کیا ہے وہ صرف اپنے ذاتی خیال سے ادا نہیں کیا بلکہ قرآن شریف اور احادیث نبوی کی ان

بزرگ تاکیدوں نے جو اس عاجز کے پیش نظر ہیں مجھ کو اس شکر ادا کرنے پر مجبور کیا ہے ۔"

انگریزی کی اس ساری مدح سرائی کے ساتھ مزید افسوسناک امر یہ ہے کہ اس کتاب کے آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ان سارے اسناد اور سرٹیفکیشوں کی نقل انگریزی میں اور ان سب کا ترجمہ فارسی میں دیا ہے جو مرزا غلام مرتضیٰ صاحب والد مرزا غلام احمد کو جے نکلسن صاحب اور رابرٹ کاسٹ صاحب بہادر کمشنر لاہور اور سر رابرٹ ایجرٹن صاحب بہادر فنانشل کمشنر پنجاب نے بکمال خوشنودی عطا فرمائے تھے ۔" میں سمجھتا ہوں کہ مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی انگریزوں سے وفاداری اور نمک خواری اتنی قابلِ تأسف و مذمت نہیں جتنی باعثِ شرم روش اس شخص کی ہے جو اپنے باپ کی سوانح حیات کے ان سیاہ اوراق کو فخر و مباہات کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے ۔ اسے اپنے مسیح موعود، مجدد اور مُلہم من اللہ کے مدعی ہونے کی کچھ تو لاج رکھنی چاہیئے تھی ۔ پھر اس نبی کے پیروؤں کی یہ حرکت قابلِ دید اور قابلِ داد ہے کہ وہ بھی اپنے "سلطان القلم" کے ان الہامات کی اشاعت میں کچھ حجاب محسوس نہیں کرتے ۔ میں نے یہ سارے اقتباسات "شہادت القرآن" کے اس نسخے (آخری سولہ صفحات) سے نقل کیے ہیں جو نظارتِ اصلاح و ارشاد صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے ۔

مرزا غلام احمد نے اپنی اس کتاب "شہادت القرآن" کے صفحہ ۲ پر علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے الفاظ کا ذکر بطورِ حدیث کیا ہے اور اسے اپنے مسیح موعود ہونے کے لیے بطورِ ثبوت پیش کیا ہے، حالانکہ یہ الفاظ کسی حدیثِ صحیح میں وارد نہیں، نہ کسی محدث نے اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا ہے ۔ اسی کتاب کے ص۴۱ پر مرزا غلام احمد نے مہدی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لیے آواز آئے گی کہ ھذا خلیفۃ اللہ المھدی ۔ اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ اور مرتبہ کی ہے جو ایسی کتاب میں درج ہے جو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ ہے ۔" یہ بھی مرزا غلام احمد کی دروغ بافی ہے ۔ ایسی کوئی حدیث صحیح البخاری میں موجود نہیں ۔ اسی طرح اس کتاب میں ایک عورت سے موعود نکاح کے متعلق متعدد پیشگوئیاں اور وعیدیں ہیں جن کا نقل کرنا بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے اور جو سب کی سب جھوٹی ثابت ہو چکی ہیں ۔ یہ اس کتاب کے مندرجات کا حال ہے جس کا نام "شہادت القرآن" ہے ۔ اس کے باوجود جو شخص اس کے مصنف کو سچا تسلیم کرتا ہے، اُسے مجدد یا نبی مانتا ہے، اس کی عقل اور عقیدے پر حیف، صد ہزار حیف ہے ۔

مرزا غلام احمد اور اس کے پیرووں نے قرآن اور احادیثِ صحیحہ کے کلمات و نصوص میں ایسی تحریف کی ہے جو انکار کے مترادف ہے۔ ایسی ہی تحریف یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتابوں میں کی تھی جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، یعنی وہ لفظوں کا الٹ پھیر کر کے انہیں کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں اور کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید، سورۃ الصف، آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (اور یاد کرو جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمدؐ ہوگا)۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ پیشن گوئی جو انجیل اور قرآن میں وارد ہے اس پر پہلے سینٹ پال کے پیرو عیسائیوں نے اس طرح ہاتھ صاف کیا کہ انجیل کے اصل لفظ میں ردو بدل اور اس کا غلط ترجمہ کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا اور برنا باس جو حضرت مسیح کے اصل حواری تھے اور جن کی انجیل میں آج بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک موجود ہے، اسے جعلی قرار دے کر اس کے سارے نسخے غائب کر دیے۔

اس کے بعد نبی اور مسیح ہونے کے جھوٹے مدعی غلام احمد اور اس کی امت نے عیسائیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قرآن مجید کی آیت مذکورہ میں یہ تحریف کی کہ احمد سے مراد غلام احمد لے لیا اور حضرت مسیح علیہ السلام نے جو بشارت اپنے بعد آنے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی تھی اسے اپنے اوپر چسپاں کرنے کی ناپاک جسارت کرتے ہوئے ذرہ برابر حیا محسوس نہ کی۔ میں پوچھتا ہوں کہ مرزا غلام احمد کا نام اس کے باپ غلام مرتضیٰ نے جب غلام احمد رکھا تھا اس وقت اُس نے جن احمدؐ کا غلام اپنے بیٹے کو بنانا چاہا تھا کیا وہ احمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھے؟ لیکن افسوس کہ اس غلام احمد نے اپنے آپ کو احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ثابت کرنے کے بجائے پوری خیرہ چشمی کے ساتھ اپنے آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اس بشارت کا مصداق بنا لیا جو ہمارے آقا و مولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھی۔ ربوہ سے حال ہی میں شائع شدہ کتابچہ "دینی معلومات" میں بھی اس کا اطلاق مرزا غلام احمد پر کیا گیا ہے۔ افریقہ اور دوسرے بعض ممالک میں جو لٹریچر قادیانیوں نے پھیلایا

ہے، میں نے دیکھا ہے کہ اس میں متعدد مقامات پر مرزا غلام احمد کا نام فقط احمد لکھا گیا ہے۔

جس ڈھٹائی کے ساتھ مرزا غلام احمد اور اس کی اُمت نے قرآن مجید کی اس آیت میں تحریف کی ہے، اسی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ انہوں نے آیۂ خاتم النبیین اور نزولِ مسیح و ختم نبوت سے متعلق احادیثِ صحیحہ میں بھی تاویل کے پردے میں تحریف کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس کی پوری حقیقت مولانا مودودی کی تفسیر سورہ احزاب، رسالہ ختم نبوت، قادیانی مسئلہ اور منیر تحقیقاتی عدالت میں ان کے تیسرے بیان سے واضح ہو جاتی ہے۔ دوسرے علماء کرام بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور اس معاملے میں پوری طرح اتمامِ حجت ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود اگر قادیانی یہ کہیں کہ ہم ختم نبوت اور اجرائے نبوت دونوں کے قائل ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم توحید و تثلیث دونوں کے قائل ہیں، تین میں ایک اور ایک میں تین خدا ہیں اور مسیح ابن آدم بھی ہیں اور ابن اللہ بھی ہیں۔ اس طرح کی حجت و تاویل درحقیقت انکار و تحریف ہے جو قادیانیوں کی تکفیر میں کسی طرح مانع نہیں ہے۔ میں انہیں شرح صدر کے ساتھ اور علی وجہ البصیرہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں اور جب تک وہ کفر سے تائب نہ ہوں اور مرزا غلام احمد کی نبوت کا انکار نہ کریں، اس وقت تک انہیں مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا۔

آپ نے میری کتاب پڑھ کر مجھے صاحبِ علم اور غیر متعصب انسان لکھا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے مجھے انسان کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی سمجھا ہے یا نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے اس خط کے بعد آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے۔ بہرحال میں نے اپنی حد تک تبلیغِ حق کا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو قبولِ حق کی توفیق بخشے۔ میری بعض باتیں ممکن ہے کہ آپ کو کڑوی اور ناگوار محسوس ہوں لیکن اس جھوٹی اور خانہ ساز نبوت نے جس طرح ہمارا دل زخمی اور سینہ فگار کیا ہے، اس کے بعد ہم اس تلخ نوائی پر مجبور و معذور ہیں۔ جن الہامی مغلظات سے مرزا غلام احمد نے سارے مسلمانوں کو نوازا ہے، میری ان معروضات کو ان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

ایمان بحیثیت اساسِ اخلاق

شیخ یوسف القرضاوی
ترجمہ :- عبد الحمید صدیقی

نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ایک مخفی قوت موجود ہوتی ہے جسے نہ خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے نہ علم الطبیعات اس کا ادراک کر سکتا ہے ۔ اس کا کام فرائض و واجبات کی طرف انسان کی رہنمائی کرنا ہے ۔ اور خیر و صلاح کی طرف اُسے اس طرح کھینچ لینا جیسے مقناطیس قطب نما کی سوئی کو کھینچے رکھتا ہے اور شر و فساد سے اسے بچانا جیسے باپ بیٹے کو غلط حرکات سے بچاتا ہے یا جیسے استاد اپنے تلامذہ پر نظر رکھتا ہے ۔ یہ باطنی قوت جو تاریکی میں روشنی کا کام دیتی ہے ، فضائل پر آمادہ کرتی اور رذائل سے باز رکھتی ہے ، معروف کا حکم دیتی اور منکر سے منع کرتی ہے علمائے اخلاق اسے ضمیر اور وجدان سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور اسلام نے اِسی کا نام القلب یعنی دل رکھا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا " ہر وہ کام نیکی ہے جسے کر کے باطن سکون محسوس کرے اور دل مطمئن ہو اور گناہ وہ کام ہے جس کے ارتکاب سے نہ نفس کو سکون حاصل ہو اور نہ دل کو اطمینان اگرچہ مفتی حضرات تجھے اس کے جواز کا فتویٰ دے ڈالیں " اور ایک دوسری حدیث میں ہے ۔ آپؐ نے فرمایا " اگرچہ لوگ تجھے فتویٰ دیں تاہم تو اپنے دل سے فتویٰ طلب کر "

قلب و ضمیر اخلاق کا بنیادی ستون ہے ۔ اس کے بغیر اخلاق کی عظیم الشان عمارت قائم نہیں رہ سکتی ۔ زندہ ضمیر اخلاق کی تعمیر و تشکیل کا باعث بھی ہوتا ہے اور ایک مستعد دربان کی طرح اس کی حفاظت بھی کرتا ہے ۔ کوئی معاشرہ محض قوانین اور آئینی ضوابط کے بل بوتے پر یا پولیس اور فوج کی قوت سے ترقی و تنظیم اور سعادت و خوش بختی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ۔ حصولِ سعادت کے لیے بیدار ضمیر اور زندہ قلوب کا وجود ضروری ہے ۔ اور یہ کلمۂ حکمت تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ عدل و انصاف قانون کے الفاظ میں نہیں بلکہ قاضی اور حاکم کے ضمیر میں ہوتا ہے ۔ ٹھیک اِسی طرح عامۃ الناس کی نظر میں قانون کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ۔

ایک شاعر نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ؎

لن یصلح القانون فینا رادعاً حتی تکون ذوی ضمائر تودع

(ترجمہ) قانون کی سرزنش ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی جب تک کہ ہم خوف سے لبریز دلوں کے حامل نہ بن جائیں۔

پس جب اخلاق کے نشوو ارتقا میں ضمیر اس درجہ دخیل ہے تو آئیے اس امر کا جائزہ لیں کہ خود ضمیر کی تخلیق کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟

ضمیر اور ایمان ضمیر کی تعمیر و تخلیق میں ایمان بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اسے زندگی عطا کرنے، اس کی آواز کو زیادہ موثر بنانے اور ہر قدم پہ اس کی محرک اور فعال حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ایمان ناگزیر ہے۔ اللہ پر ایمان، انسان کے اندر یہ اعتقاد راسخ کر دیتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ سفر میں، حضر میں، خلوت میں، جلوت میں اللہ سے اس کی کوئی کیفیت چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ انسان کے نہاں خانۂ دل و دماغ کے اسرار و رموز، اس کے پوشیدہ اعمال اور اس کی ظاہری حرکات ہر ایک سے اللہ پوری طرح باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (المجادلہ ۔ ۷)	کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو یا پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔
وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ	اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور

مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ	قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو!
اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ	تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران
تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ	ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں کوئی ذرہ برابر چیز
رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ	آسمان میں اور زمین میں ایسی نہیں ہے نہ چھوٹی
وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ	نہ بڑی جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ
وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ (یونس: ۶۱)	ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔

ایمان باللہ کے بعد ضمیرِ انسان کو جو چیز مزید سنوارا اور نکھار دیتی ہے وہ یوم آخرت پر ایمان ہے۔

یوم آخرت پر ایمان دراصل اِس حقیقت کا شعور ہے کہ مرنے کے بعد رب العزت کی بارگاہ میں انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے ہر اچھے عمل کی جزا وصول کرنی ہے اور ہر برائی کا خمیازہ بھگتنا ہے اُس وقت اس کی زندگی کی لمحہ بہ لمحہ تفصیل اس کے سامنے رکھ دی جائے گی۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ	دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے
وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ	ہر چیز ثبت کر رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان
قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۔	سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک
(ق - ۱۸)	حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔
اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ	کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ
وَنَجْوٰهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ	باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے ہیں۔ ہم سب
يَكْتُبُوْنَ ۔	کچھ سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے
(الزخرف - ۸۰)	پاس ہی ہر چیز لکھتے جاتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کا یہ سارا ریکارڈ ——— جسے اللہ کے فرشتوں نے پوری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ مرتب کیا ہوگا اور جس کے مطابق انسان سے مواخذہ و محاسبہ کیا جائے گا ——— ایک ایسی ناقابلِ تردید دستاویز ہوگی کہ جس کا ذرا سا احساس ہی قلب کی زندگی کا ضامن اور ضمیر کی بیداری کا باعث ہے۔

اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد اور یوم آخرت پر اِس نوعیت کا ایمان ہی انسان کو ہر آن اللہ کی

نگرانی کا احساس دلاتا ہے اور اپنے نفس کے محاسبہ پر مجبور کرتا ہے چنانچہ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے افعال و اعمال کا جائزہ لیتا ہے، نتائج و عواقب پر نظر رکھتا ہے۔ نہ ظلم و ستم کرتا ہے نہ خیانت و بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے نہ ڈینگیں مارتا ہے اور نہ تکبر کرتا ہے۔ نہ اپنے فرائض کا انکار کرتا ہے اور نہ دوسروں کے حقوق کا دعویدار ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے محاسبے سے کُلی خائف ہو۔ نہ چھپ کر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے کہ جس کے منصۂ شہود پہ آنے سے اسے ندامت لاحق ہوسکتی ہو۔ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقینِ کامل اُسے راہِ صواب سے ذرہ برابر اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ کما قال شاعر صوفی ؎

إذا ما خلوتَ الدهرَ یوماً فلا تقل خَلوتُ ولکن قُل علیَّ رقیبٌ

ولا تحسبن اللہ یغفل ساعۃ ولا ان ما تخفیہ عنہ یغیبُ

(ترجمہ) اگر تو کبھی ایک دن کے لیے بھی خلوت نشین ہو تو یہ نہ کہہ کہ میں اب تنہا ہوں بلکہ یہ کہہ کہ مجھ پر ایک علیم و خبیر نگران ہے اور اللہ کے بارے میں کبھی یہ گمان نہ کر کہ وہ ایک لحظہ کے لیے بھی غافل ہو جاتا ہے یا جو کچھ تو اس سے چھپانا چاہتا ہے وہ اس کی نظر سے فی الواقع چھپ جاتا ہے۔

صوفیاء اور احتسابِ نفس

ایک اہل اللہ سے سوال کیا گیا کہ اِس ارشادِ الٰہی کا کیا مطلب ہے:

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ۔

اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور یہ مقام اُس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے رب سے ڈر جائے۔

انہوں نے فرمایا کہ رب سے ڈر جانے کا مطلب ہے اپنے آپ کو رب کی نگرانی میں محسوس کرنا، اپنے نفس کا محاسبہ کرنا اور آخرت کے لیے توشۂ حسنات جمع کرنا۔

محمد بن علی الترمذیؒ نے فرمایا: اپنے آپ کو اُس ذات کی نگرانی میں دے دے کہ جس کی نظر سے تو کبھی چھپ نہیں سکتا۔ اپنے شکر و سپاس کو اُس کے لیے خاص کر دے کہ جس کے انعامات کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ صرف اُس کی فرمانبرداری اختیار کر کہ جس سے تو کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا اور اپنے خشوع و خضوع کا مستحق اُس کو گردان کہ جس کی سلطنت سے قدم باہر رکھنا ممکن نہیں۔

حضرت ذوالنونؒ مصری سے پوچھا گیا: بندہ جنت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا پانچ چیزوں

سے: استقامت سے جو ہر شائبہ مکر و انحراف سے پاک ہو۔ کوشش سے جس میں سہو و نسیان نہ ہو۔ خوفِ خدا سے جو بظاہر بھی ہو اور باطن بھی۔ موت کی تیاری کرنے کے بعد اس کے انتظار سے اور محاسبۂ نفس سے پیشتر اس کے کہ اُس کا حساب لیا جائے۔

بلاشبہ وہ ضمیر جس کی تربیت ایمان کرتا ہے ۔۔ خوفِ خدا اور حسابِ آخرت سے سرشار ایمان ۔۔ بیدار و توانا اور شدید الحس ہو جاتا ہے۔ وہ عمل سے پیشتر ہی انسان کا احتساب کرتا ہے۔ کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیوں کرنا چاہتا ہے؟ کس کے لیے کرنا چاہتا ہے؟ پھر اسی پر اکتفا نہیں وہ عمل کے بعد بھی محاسبہ جاری رکھتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ کیوں کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ نورِ ایمان سے منور ضمیر بڑا مستعد قاضی ہوتا ہے جو جزا یا سزا پر مشتمل اپنا فیصلہ فوراً صادر کر دیتا ہے اور اس کا فیصلہ باطنی طعن و ملامت ہی کی صورت نہیں اختیار کرتا بلکہ کبھی کبھی مادی و جسمانی سزاؤں کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

حضرت حسن بصری نے "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن جب بھی اپنے گریبان میں منہ ڈالتا ہے نفس کو معتوب کرنے لگتا ہے۔ میری اس بات سے تیری مراد کیا تھی؟ میرے کھانے میں تیرا کیا ارادہ مضمر تھا؟ میرا پینا کس مقصد کے تحت تھا؟ مگر فاسق و فاجر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے وہ معصیت میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اور کبھی پلٹ کر نفس پر عتاب بھیجنے کی اُسے توفیق نہیں ہوتی۔

حضرت مالک بن دینار نے فرمایا: اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے اپنے نفس کو سرزنش کرتے ہوئے کہا ۔۔ کیا تو اس چیز کا مالک نہیں؟ کیا تیرے پاس وہ چیز نہیں؟ اللہ کی نعمتیں یاد دلانے کے بعد پھر نفس کو لگام دی اور نکیل ڈال دی اور کتاب اللہ کی پیروی پر اسے مجبور کر دیا۔

حضرت ابراہیم التیمی نے فرمایا: میں عالمِ تصور میں اپنے نفس کو جنت میں لے گیا اور اس کے پھل کھانے لگا۔ اس کی صاف شفاف نہروں کا پانی پیا اور وہاں کی حسین و جمیل دوشیزاؤں سے بغل گیر ہوتا رہا۔ بعد ازاں اپنے نفس کو دوزخ میں لے آیا۔ جہاں اُس کے کڑوے کسیلے پھل کھائے اُس کے بدکرداروں کا لہو اور پیپ پینے کی کوشش کی اور طوق و سلاسل پہنے مبتلائے مصیبت رہا۔ پھر میں نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا ان میں سے کون سا مقام تجھے مطلوب ہے؟ نفس نے جواب دیا: میں سر دست دنیا ہی میں رہ کر کچھ اعمالِ صالح کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آنجناب نے فرمایا: تیری مراد پوری ہو گئی اب عمل ہی کیے جا۔

مذکورہ بالا احوال و واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان، ضمیر کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کیا

کیا صورتیں اختیار کرتا ہے؟ جناب احنف بن قیس اس مقصد کے لیے ایک اور طریقہ اختیار فرمایا کرتے تھے۔ آپ چراغ کے پاس چلے جاتے اور چراغ کی لو پر انگلی رکھ دیتے جب آگ اسے جلانے لگتی تو آپ اپنے نفس سے کہتے۔ اے احنف گناہوں کی سزا یہی آگ ہے۔ فلاں دن تو نے جو (گناہ) کیا تھا تجھے اس پر کس چیز نے اکسایا؟ اور فلاں دن تو نے جو کچھ کیا اُس پر کس چیز نے مجبور کیا؟ کیا اُس وقت آگ کا خوف نہ تھا۔

محاسبۂ نفس کا ایک اور اسلوب وہ ہے جو توبۃ الصمۃ سے مروی ہے۔ آپ نے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنی عمر کا حساب لگایا تو وہ ساٹھ سال بنی پھر آپ نے ان سالوں کے دن گنے تو وہ اکیس ہزار پانچ سو ہوئے۔ اس پر آپ چیخ اٹھے اور گویا ہوئے ہائے افسوس ۲۱۵۰۰ گناہوں کو لے کر خدا کے دربار میں حاضر ہوں گا۔ پھر خیال آیا کہ گناہوں کی یہ تعداد تو اس صورت میں ہے اگر روزانہ ایک ہی گناہ کیا ہو۔ لیکن اپنا حال تو یہ ہے کہ ایک ایک دن میں ہزاروں گناہ سرزد ہوئے ہیں۔

اوپر ہم نے کہیں ذکر کیا ہے کہ ضمیر کے فیصلے کے نتیجے میں کبھی کبھی مادی سزا بھی آدمی کو مل جاتی ہے اور بیدار ضمیر انسان اسے بخوشی اور بلا تاخیر قبول کر لیتا ہے تو اس کی مثال حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واقعہ ہے کہ آپ ایک روز اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ خوشگوار ماحول میں نماز پڑھتے وقت آپ کی توجہ شاخِ شجر پر بیٹھے ہوئے ایک پرندے کی طرف مبذول ہو گئی اور آپ کو تھوڑی دیر کے لیے احساس نہ رہا کہ آپ حالتِ نماز میں ہیں۔ بعد میں جب خیال آیا کہ بجائے اللہ کے دل پرندے کی طرف مائل رہا ہے تو آپ نے اس نقصان کا کفارہ یوں ادا کیا کہ پورے باغ ہی کو صدقہ کر ڈالا اور آئندہ کے لیے ایسے ہر نقصان سے محفوظ ہو گئے۔

(بقیہ اشارات) پھر اس بات کی بالکل بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ حکومت نسلی اور لسانی بنیادوں پر ابھرنے والی چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو ملک کے لیے فی الواقع خطرہ سمجھتی ہے اور ان کی جگہ ملی اتحاد کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ اسلام کو اس ملک کے آئین کی اساس اور بنیاد تسلیم کرنے کے باوجود اور حکومت کے سربراہ اس کا حلف اٹھانے کے بعد بھی کھلے بندوں ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں جو اسلام کی عین ضد اور اس دستور سے بالکلیہ انحراف کے مترادف ہیں۔ دستور سے انحراف کی یوں تو بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر یہاں ہم مرکزی حکومت کے ایک وزیر با تدبیر جو بھٹو صاحب کے دستِ راست شمار کیے جاتے ہیں، کی تقریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت قومی سالمیت اور اتحاد کی کس حد تک خواہاں ہے۔ وزیر صاحب نے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا:

"چونکہ پیپلز پارٹی میں بعض ایسے عناصر گھس آئے ہیں جو سوشلزم کے خلاف ہیں اس لیے ان کا پارٹی سے اخراج ناگزیر ہے۔ سوشلزم پاکستان پیپلز پارٹی کے کونے کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ سوشلزم ہی سے تمام خرابیاں دور کی جا سکتی ہیں لہٰذا ہمیں ملک میں سوشلزم قائم کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کرنا ہو گی اور اس نظام پر ڈٹ کر قائم رہنا ہو گا"

(نوائے وقت ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء)

جو شخص سوشلزم کے مزاج، اس کے عناصر ترکیبی اور اس کی تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ سوشلزم اور اسلام دو ایسے الگ الگ ضابطہ ہائے حیات ہیں جن میں کوئی اساسی چیز بھی قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوشلزم کا سارا فلسفہ تاریخ کی مادی تعبیر کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا پورا نظام خدا پرستی کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ سوشلزم کا خمیر جدلی مادیت سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا انفرادی اور اجتماعی ڈھانچہ دینی اور اخلاقی اقدار سے تیار کیا گیا ہے۔ سوشلزم کا قافلہ طبقاتی نزاع اور تصادم کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے اور اس کے مقابلے میں کاروانِ اسلام کی پیش قدمی کا بیشتر انحصار انسانوں کے مابین جذبۂ تعاون و اخوت پر ہے۔ اشتراکیت اپنی نظریاتی برتری اور بین الاقوامیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں کر سکی جس پر خالص اشتراکی قومیت کی تعمیر و تشکیل ممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک ہی ملک کے اندر رنگ اور نسل کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تشکیل کی ضرورت لاحق رہی ہے اور پھر انہیں ایک اجتماعیت میں جکڑنے کے لیے بڑے ظالمانہ بلکہ سفاکانہ قوانین اور ضابطوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اشتراکیت قومیت کی کسی

مثبت بنیاد سے کس حد تک محروم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے اندر کسی اختلافِ رائے کو برداشت کرنا تو کجا کریملین کو چیکوسلواکیہ میں ڈ بچک کی ترمیم پسندی بھی کسی لحاظ سے گوارا نہ ہوئی اور ہلکے سے اختلاف کو جس کی حیثیت نظریاتی نہیں بلکہ تدبیرِ منزل کی سی تھی اسے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی مدد سے دبا دیا گیا۔

اگر پاکستان میں اسلام کے بجائے سوشلزم کا نفاذ ہی ہونا ہے تو پھر اس ملک، اس کی سالمیت اور خود مختاری کی حیثیت خوابِ پریشان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ سوشلزم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں صوبائی تعصبات اور لسانی جھگڑے پوری شدت کے ساتھ اُبھریں گے۔ چنانچہ دیکھیے کہ اس ملک میں اشتراکیت کے علمبردار پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی ان مذموم کاروائیوں میں اب تک مصروف چلے آرہے ہیں جن کا مقصد پاکستانی قومیت کی اسلامی بنیاد کو ڈھا کر ملک کے باشندوں کے اندر صوبائی عصبیت، علاقائی تہذیب اور لسانی اختلافات کو زیادہ سے زیادہ اُبھارنا ہے کیوں کہ ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ ہی اسلام کا رشتۂ اخوت کمزور اور مضمحل کیا جا سکتا ہے۔ ان غیر اسلامی بلکہ جاہلی تعصبات کو ہوا دینے میں روس کس قدر دلچسپی لے رہا ہے اس کا اندازہ اس کتاب سے لگایا جا سکتا ہے جو "پاکستان کی اقوام" (THE PEOPLES OF PAKISTAN) کے نام سے شائع ہوئی ہے اور جس کی ملک کے اندر بڑے وسیع پیمانہ پر اشاعت کرائی جا رہی ہے۔ اس کتاب میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جو خطۂ پاک میں چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو جنم دینے اور انہیں طاقت و قوت بہم پہنچانے میں مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس چیز کو نظر انداز کیا گیا ہے وہ اسلام ہے۔ ان حالات میں ہم اس ملک کے ہوش مند اور سنجیدہ طبقوں سے خواہ ان کا تعلق حزبِ اقتدار سے ہے یا حزبِ اختلاف سے بصد احترام عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ عوام کے جذبات سے کھیلنے اور آرڈیننسوں کی مدد سے ملکی سالمیت قائم کرنے کی سطحی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے اس مقصد کے لیے کوئی ٹھوس اقدام کریں اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ ان کا اٹھایا ہوا قدم اہلِ پاکستان کے اسلامی احساسات اور جذبات کی کس حد تک نشوونما کرتا ہے کیوں کہ ان احساسات کے بغیر اس ملک میں قومی اتحاد کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

مطبوعات

جدوجہد آزادی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ	تالیف: پروفیسر احمد سعید صاحب شائع کردہ:۔ خالد ندیم پبلی کیشنز۔ کشمیری بازار، راولپنڈی قیمت:۔ پانچ روپے، پچاس پیسے، صفحات:۔ ۱۷۰

پروفیسر احمد سعید صاحب ایک نوجوان تاریخ دان کی حیثیت سے ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ تاریخی مواد کی تلاش پھر اس کی ترتیب و تدوین، گزرے ہوئے واقعات کا گہرا تجزیہ اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا انہیں خدا تعالیٰ نے خاص ملکہ عطا فرمایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان صفات کی پوری طرح حامل ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں اس باطل خیال کی، جسے ایک خاص طبقہ بڑی چالاکی اور عیاری کے ساتھ ایک منصوبے کے تحت پھیلا رہا ہے، کہ تحریک پاکستان کی اساس دینی نہ تھی بلکہ معاشی تھی، نہایت ٹھوس شواہد سے تردید کی گئی ہے۔ پھر انہوں نے مستند حوالوں سے اس حقیقت کو بھی ثابت کیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے سارے علماء تحریک پاکستان کے مخالف نہ تھے بلکہ علماء کی بہت بڑی تعداد نے جن میں مولینا اشرف علی تھانویؒ جیسے نامور عالم شامل تھے اس تحریک کو قوت بہم پہنچائی۔ یہ ان علمائے اکرام کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تحریک کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

تبصرہ نگار کو جہاں فاضل مصنف کے علمی شغف کو دیکھ کر مسرت ہوئی ہے وہاں اُسے اس بات سے بھی اطمینان ہوا ہے کہ پروفیسر صاحب نے تحریک پاکستان سے الگ رہنے والے علماء کا تذکرہ بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور ان کے نقطۂ نظر کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان کے لیے وہ زبان استعمال نہیں کی جو کہ آج کل کے بعض نام نہاد تاریخ دان اور پاکستان کی محبت کے جھوٹے دعویدار استعمال کرتے ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ جو ہمارے نزدیک مواد کے لحاظ سے سب سے زیادہ جاندار ہے اس میں البتہ یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اقتباسات درج کرتے وقت ان کے مآخذ بیان نہیں کیے گئے۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف اگلی اشاعت میں اس کا التزام کر دیں گے۔ کتاب کے آخری چند صفحات جن میں مولانا حسینؒ احمد مدنی اور مولاناؒ تھانوی کے ایک دوسرے کے بارے میں جذبات محبت و احترام درج ہیں، بڑے وقیع ہیں اور اُن سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دل میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و کدورت نہ ہو تو اختلافات کے باوجود نہایت خوشگوار تعلقات قائم رکھے جا سکتے ہیں۔ کاش ان دونوں حضرات کے معتقدین اور منتسبین اپنے حلقے سے باہر بھی اختلافِ رائے کے احترام کا عملی نمونہ پیش کر سکیں۔

پاکستان مسلم لیگ کا دورِ حکومت تالیف:۔ جناب صفدر محمود صاحب۔

شائع کردہ:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور۔

قیمت:۔ بیس روپے صفحات ۲۲۴

اس کتاب کے مصنف جناب صفدر محمود صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ واحد نوجوان مصنف ہیں جنھوں نے پاکستان پر انگریزی اور اردو میں کئی ایک مستند اور وقیع کتابیں لکھی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی ان کے علمی ذوق کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ مسلم لیگ کا عروج و زوال مسلم قوم کے لیے بیک وقت طربیہ بھی ہے اور المناک حزنیہ بھی۔ طربیہ اس وجہ سے کہ اس تحریک نے اس برِ عظیم کے مسلمانوں کے دلوں میں نیا عزم اور تازہ ولولہ پیدا کیا جس کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ مگر افسوس کہ یہ تنظیم اپنی داخلی کمزوریوں اپنے بعض رہنماؤں کی بے تدبیریوں اور بے اعتدالیوں کی وجہ سے اس ملک کو سنبھال نہ سکی جسے اس نے بڑے مقدس نعروں اور خوش کن وعدوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ بات اگرچہ بڑی دلخراش ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس لیگ کی کوششوں سے یہ ملک بنا تھا اسی لیگ کے ہاتھوں اسے ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا، خصوصاً اس خطۂ پاک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا جو عزم لے کر اس نے جدوجہد شروع کی تھی اس کی تکمیل میں لیگ یکسر ناکام رہی۔ اس میدان میں اس کی اسی المناک ناکامی کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان کے مقصدِ وجود کے بارے میں کئی ایک متضاد باتیں کی جانے لگی ہیں۔ لیگ کو ملک میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اگر وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس مقصد کی تکمیل میں منہمک ہو جاتی تو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیائے اسلام کا نقشہ اس سے بہت مختلف ہوتا جو کہ آج ہمیں نظر آ رہا ہے۔ فاضل مصنف نے مواد کی فراہمی، اس کی تدوین و ترتیب میں بڑی محنت اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اور ملک کے مشہور ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰۴ — ستمبر ۱۹۷۳ء — فون نمبر ۵۲۵۰۷

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر

تفہیم القرآن

کے نئے ایڈیشن

جلد اول :- سورۃ الفاتحہ ـــــ سورۃ الانعام		۳۱/- روپے
جلد دوم :- سورۃ الاعراف ـــــ سورۃ بنی اسرائیل		زیرِ طبع
جلد سوم :- سورۃ الکہف ـــــ سورۃ الروم		۳۵/- روپے
جلد چہارم :- سورۃ لقمان ـــــ سورۃ الاحقاف		۲۸/- روپے
جلد پنجم :- سورۃ محمد ـــــ سورۃ الطلاق		۳۰/- روپے
جلد ششم :- سورۃ التحریم ـــــ سورۃ الناس		۳۰/- روپے

پلاسٹک کور فی جلد ـــــ ۱/۵۰ روپے

اپنے قریبی بک سٹال سے حاصل کیجیے

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور